

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دہسٹر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گت بد صورت رویوں، بد بینیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ہمارے ”سنے نوٹے“ ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguogroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ”میرے محبوب یہ تیری ایک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے..... مگر تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ.....“ اس بار کا موسم گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے، دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جن کر رہا تھا۔ تیز گرم تپتی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنسان سڑک کسی سیاہ گلیشیر سے نکھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جوتوں کا تلوایچے سے کئی جگہ سے کھل چکا تھا، لہذا اہلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں اٹکارے بھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پہل صراط مجھے ہر روز سی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار وہ بے لفظوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شار کی حد سے نکلتے جا رہے ہیں، مگر نو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا، تو میری عرضی کا نمبر چھٹا تھا اور ابا کی تنخواہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سُن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسب معمول چند لڑکوں کے لیے جوتوں کی بڑی دکان کے چھتر تلے سنانے کے لیے ٹھہرا اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے تجسس کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کورا رہا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کر واپس لے گیا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دودھ میں ڈھلی، آبشار کی جلتی رنگ کی مانند نکھری نکھری سی..... مگر خیالات کا تسلسل جلدی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور وقارت بھرے لہجے میں مجھے جھڑکنے لگا۔ ”اوئے! کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گندا کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔“ میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بس نہجالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و وقارت، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا گلہ، شکوہ، میری صورت، میرا حلیہ ایسے رویے، ایسی ہی نفرت و وقارت کا متقاضی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ ابا ایک شربت پیک کرنے والی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گتے کے ڈبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصے کا جن کھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کو نوں کھدروں میں دیک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اور پرے نو بچوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غرب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آنگن بچوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ نانی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسب معمول کم خوراک کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاہی میرے مقدر کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خالہ کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ”آئے ہائے باجی! یہ اتنا کالا کونسا بچہ کس پر چلا گیا، لگتا ہے، جیسے آنگن میں اماں کی رات اُتر آئی ہے۔“ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، تھملا ہی تو گئیں ”جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد۔“ ویسے تمہاری اس بھگتی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔“ اب جلنے کی باری خالہ کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ”ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ بنتا ہے تم نے۔“ اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ”ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔“ ”پری زاؤ“ ہاں، بس یہی نام ہوگا۔ میرے بچے کا۔“ ”پری زاؤ“ آس پاس موجود سب ہی عورتیں زیر لب بڑبڑائیں اور کن آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ”پری بیکر تو سننا تھا، یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا۔“ بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تمسخر، طنز اور وقارت لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اُس روز اماں چھوٹی خالہ کے طفرے کے جواب میں خاموش رہتیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر رکش نین نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو سننے والا خود بخود قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچوں کو فردا فردا کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ ”پری زاد“ استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور ٹھیلے کو دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ ”واہ شہزادے..... نام تو بڑا اکمال رکھا ہے، ماں باپ نے.....“ استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچھٹے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اُس وقت ایک نام سمجھ نہ سکتا تھا کہ اس دوغلی دنیا میں انسان کا من چاہے، جتنا بھی میلا ہو، عین ضرور اُجلا ہونا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا یہ ہے۔ روح کا اُجلا پن اور خوب صورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں؟.....

میری بد نصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر ہی سے میرے من میں اُٹھی ”خوب صورتی کی چاہ“ کو اُس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پُری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس محفل میں سب سے اُبلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہرہ تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بادل۔ کوئی دھن ہو، بارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویروں کی دکان کے باہر گھنٹوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور ہی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر چلتی یہ خُسن پرستی تو جیسے دُہرا عذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بد صورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بد صورتی ہی چمکتی ہے۔ سو، میرے اُس پاس بھی ہر لمحہ وہ بد صورتی ہی چمکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اُٹی گلیاں، دھول اُڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بد صورت سوچ اور نظریں۔

اس پر طر ف تماشایہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چپکے سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اُس روز میں نہ جانے کس جہ سے اسکول ہی نہیں جا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چلا کر کہا کہ ”پری زاد کے باوا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟“ ابا بھگم بھگ مجھے لیے سرکاری اسپتال نیکا لگوانے پہنچ گئے، مگر تب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند ہفتوں بعد زخموں کا کھر نڈ اتا تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چپکے کے بد نما داغوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان داغوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر ہمدردی کرنے اور اماں سے ہم دردی جتانے آتے تھے، مگر بنی مذاق کی تہہ میں، طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل چھلنی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایجاد کر کے تباہی پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ انٹیم بم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا پر باد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتنا تصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں کیے بعد دیگرے اوپر نیچے نوٹے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بد قسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش! انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خاردار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے چُھپتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک خُسن پرست پری زاد، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر بھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھاؤ رکھنے والی امیدیں، گرم تہیقی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں اُنھوں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور صحن میں آگئے، چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہذا دھیرے دھیرے ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیاں نہ ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔

بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی مزید آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکادیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے صحن میں اور میں جو صحن میں سونا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی، بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر ٹین اور مٹی کا بنا یہ چھوٹا سا کمرہ گھر کا کٹھ کباڑ جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شکوے فالتو کچرا سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام ”قیمتی اشیاء“ ایک طرف سلپتے سے لگا کر اپنی پرانی چار پائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے ٹین کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی، مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی اس تنہائی سے دوستی سی ہو گئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ میسٹر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غیبت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بد صورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنادیتی، جو ضلع بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کچھ کچھ بھرے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ثنائی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کامیابی پر سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب بچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں، ٹینس ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر نصیبی سرگرمیاں تو دور، کبھی نصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لیتے تو میری نا انگلیں کا پھنکے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں مگن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہو گئی اور اس کے سسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ہا کو رخصتی کی ہامی بھرتے بنی۔ ہماری برسوں کی لگی بندھی زندگی کی روٹین میں ایک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی اور اماں نے اس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں کا یوں کوڑھوکی کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈربے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالانکہ دل بہت چاہتا تھا کہ صحن میں جہانکدہ کھلے لڑکیوں کو شور وغل اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز اوپر کرے تک آتی، تو کئی بار چھت کی منڈیر تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ صحن کی چھیلی جانب سے نیچے اترتا۔

ان دنوں سر شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھید بہت دیر میں گھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ ”گلی یا تارا“ کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ ”یار! کیا وہ، وہ آئی کہ نہیں؟“ ”کہاں یار! اس کا تو گھر سے کتنا ہی عذاب ہو چلا ہے، ٹو بتا تیری والی آئی کہ نہیں؟.....؟“ ”ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل اُس پر، سوچتا ہوں، خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں۔“ میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سننا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا، میری نظر میں وہ سب لوہر تہ عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے۔ عاشق تو لا کھل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاد و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان نکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو درکنار، کبھی ایک اپجنتی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب تر لڑکے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکتا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ ”بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟“ ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اپجنتی نگاہ مجھ پر پڑتی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا ”یار پری! جلدی سے جا کر ایک ڈیپا کیپشن کی تو پکڑ لا۔“ ہم سب عمر کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے ٹھپ کر سگریٹ پینا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرورت تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی ادنیٰ درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہو سکوں۔

ان دنوں محلے میں ناہید نامی لڑکی کا بہت چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، اس پر ہی چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھڑکی بنیادی وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پر اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بارنگلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو صحن میں بیٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ذرا سنبھلے..... میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس قہقہہ لگی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

(جاری ہے)

بائیں ہم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد راز مارا نثر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangugroup.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا صحن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ گھٹی پلکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی پل زمین میں گر گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یارب، لحاظ حسن، یارب حسن میں بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابل یقین اور ان ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو تپتی دو پہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے پلٹے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ مجال ہے، جو آج تک کسی نے اسے نیگے سر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھروالے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا، تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب صفا چٹ کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ”ارے..... ٹو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر دو بارہ پوچھا۔ ”آپ خالہ صغراں کے بیٹے ہیں ناں..... پری زاد.....“ میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پری تو آپ ہیں، میں تو صرف زادی زادی ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔ ”جی.....“ ”آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہو لیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگ لےجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا چکی تھی، مگر میرے قدم تو پیسے وہیں صحن کی ہلکی زمین میں دھن کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گھنٹوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ پل حقیقت بھی ہو سکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکاریں، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

میں جیسے کسی ظلم کے زیر اثر یا ہر گلی میں نکلتا تو حسب معمول لفظوں کی ایک ٹولی گلی کے ٹکڑ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خوب رو جوان، میرے ہم غموں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماجد کی تیز بازوں لنگ اور ہوا میں اڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم سبھی تماشاچی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں چپ چاپ کھڑے کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی، اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قرض اس کی جاذب نظر شخصیت اور ہر دل عزیز کی وجہ سے ناہید کے نام لگتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گھٹی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاننا جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ”یار! بتا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے.....“ ماجد نے ایک لمبی سر دہا بھری۔ ”کہاں یار..... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ کھلیں گے“ پھر چاکا ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”ارے پری زاد..... ٹو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے.....؟“ سب لڑکوں نے ماجد کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میں نے..... نہیں تو.....“ ماجد بنیاد ہی شکل بنا کر بولا۔ ”ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔“ اکرم نے شرارت سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماجد۔“ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے فیس پڑے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج ہی بتا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ انا

مزید مذاق بنے گا۔

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آ کر اس جھلگی سی چارپائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر گھلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جس کے لیے اس ”ستارہ جبین“ نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازیگر ہمیں گھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازیگر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازیگر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چپک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھامے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں ”خواب“ کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر رخصتی کے ٹھیک دوسرے دن جھجکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا پچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محل میں مشہور تھا۔ ”ہاں بھئی، کیا بات ہے.....؟“ انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے تو بھولا ہٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ ”اب کچھ بولو گے بھی یا پونی منہ میں گھنٹکیاں ڈالے کھڑے رہو گے؟“ میں گھٹکھٹکیاں ”جی..... وہ..... میں..... مجھے بلایا تھا خالہ نے.....“ انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ”اندرا جاؤ.....“ میں اس وقت کوکوس رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آگئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نوں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر میرا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک بدل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عمومی رویے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ بچ تو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگا تا تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا ”خیر تو ہے..... یہ کنگھی پٹی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے؟“ میں شپٹا سا گیا۔ ”تمہارے دوسوں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔“ میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی جھ سے جیسے کوئی جنگ سی جا رہی تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوئی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لہجوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گزرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور التجا میں گڑ گڑا رہے ہوتے ہیں، اسے پر لگ جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش منول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، شکر ہے، اس وقت ماہد اور اس کے دوستوں کی ٹوٹی وہاں مورچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوروں کی ٹیل کے نیچے چھپی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم بھول رہا تھا۔ دھڑکن بے قابو تھی، اور سانس زک زک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر حقیر اور متفرق دیکھا تھا کہ مجھے براہ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہذا جب ناہید اپنا سیاہ دوپٹا سر پر بٹھائے ہوئے آ کر بیٹھی، تو جب بھی میری نظریں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید جھکا لیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ ”سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح کرنا سیکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتا ہے۔“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کچھ کچھ بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر یک دم اپنے دماغ سے بٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعری تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کول ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آگئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ.....؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی سرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے ہوتے ہیں، جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ گھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو نہ پیے، نہ کھائے، نہ گناہ کے بوجھ تلے دبے اس سرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن بنا کسی نشے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خمار کے بعد صبح اترتی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ککڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے سپنے پل بھر میں کچی کچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایسا نہ ہوتا، تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس پل میرا جی چاہا کہ دنیا کے سارے آئینے

تو ڈالوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے ٹوب صورت اندھے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک ہی بنی بادی ہوئی، تو اس بصارت یا آکھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہری مجھے ماجد نے دھرایا۔ ”ہاں، شہزادے! کیا چکر ہے، ہماری بھتیجی کے گھر، وہ بھی ہم سے چھپ چھپ کے.....!“ میں نے ماجد کو ٹیوٹن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سر آدھ بھری۔ ”ہاں میاں! یہی تو فائدہ ہے تو ہے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اس ظالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں۔“ پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”ارے ہاں..... یاد آیا۔ یا ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور سنا ہے، لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔“ کوئی اور وقت ہوتا، تو میں شاید ماجد کو نال دیتا، کیوں کہ ہر ہفتے کسی نہ کسی کے قدموں میں پیچھنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقعوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوٹن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادل خواستہ چند سطور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی مائی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ”مٹا کر کن“ دھتھل کر سکے۔ میں جیسے تیسے جان ٹھنڈا کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور صحن میں بیٹھے حقہ گڑ گڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقفہ وقفہ لٹھے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتانا تصحیح ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جائیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعرو شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعری زبان یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ پل پل کانٹوں پر کاٹ کر گزارا کرتا مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے کھن کے ٹوڑی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوٹن پڑھانے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات پل کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، ننگن، چوڑیوں کی کھٹکناٹ، آواز کا زبردیوم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریر لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے دھلک کر اسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی مخروٹلی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ ان لمحوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے چکر میں، میں خود دن بھر اردو کے رٹے لگاتا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوٹن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دوسوں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سینما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیا نو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سن رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ ہیرو، پیا نو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اسی لمحے میرے اندر بھی پیا نو کیسے اور بجانے کی خواہش، ایک شدید کدک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیا نو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیا نو کے پہلو سے جڑی میرے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ میری دھن سن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاسی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں۔ کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سرائت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک میںیں اُداس اور بے چین رہ سکتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوٹن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے تو اب ہفتے میں صرف تین دن ٹیوٹن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دھرائی کے لیے مقرر کر دیئے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوٹن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید کُسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوتی ہے، جیسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سمجھنے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تجھے یہ باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اسی تجھے میں مقید رہتا۔

اُس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اٹھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا چیخنے چلاتے پیچھا کر رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا، تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ”نہ میاں..... کوئی کسی کی چھت پر اونہی نہیں پاتا۔ ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا۔“ دوسرے صاحب منمنائے۔ ”ہاں بھئی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بڑوں کی عزت اور غیرت کیا جانے۔“ چتا چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیت ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے اُن کے چھت پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کام یاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے افواہوں اور بد نامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور باکردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے حاشا پینٹا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اباجی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی سن گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔ ”یہ رہا..... یہاں گھر میں چُھا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھٹاؤ نے کروتوت ہیں اس کلوے کے۔“ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ”جی.....؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟“ ”کیا کیا ہے تم نے؟“ ”خوب..... ابھی بتاتا ہوں۔“ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پچھانا ہوں میں لٹھے۔“ میں نے پہلی نظریں میں ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ”ہاں..... مگر یہ خط تو میں نے۔“ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زکاتے دار چاٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم جو ان نسل کے پسندیدہ، منکک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسمز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا مرکز امت بھولیے گا۔ ہمارا پادہ پی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گروڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ستائے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونجی، جیسے ہم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجھے کوٹانے لگے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کو داتا اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اُس وقت ہوئی، جب وہ چھت پر کپڑے ڈالنے لگیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا ترا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھروالے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کا درجہ میری تحریر سے بھرپور تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپڑ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے مدھم پڑنے لگے، مگر روح پر تلے تھپڑ کے داغ پھر عمر بھر مندمل نہ ہو پائے۔ بھٹڑ کے چھتے ہی اتار اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر صحن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیلگوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نسنی۔ ”اچھا..... تو یہ تھی تمہاری ٹیوشن..... خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے..... عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لینی تھی۔“ جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک اک طعنہ بھی کسی تازیانی کی طرح لگتا ہا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا پائیکٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماجد کو دیا گیا وہ نقد ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ چھت پر پڑا کسی صلی کی تنہا کے لیے تو نہیں ہوتی، پروانے کو شمع سے موم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دسویں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بہ مشکل سینکڑ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پینرول ہوٹلس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمحے کو یوں لگا، جیسے آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا، تو وہ واقعی ناہید تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بریک میں سموسے چینی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون ہوں، اور اگر ناہید نے برا مانا یا اور غصہ کیا تو پھر..... ایک اور تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر دوبارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آنا سامنا ہوا پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو مہینہ بھر مجھ سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کبھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر مزید کچھ سوچے بنا کینے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اندر بہت رش تھا، میں پریشان لگا ہوں سے اُسے چاروں طرف کھون رہا تھا، اور پھر..... وہ مجھے ایک کیبن کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ ہیرا کچھ دیر پہلے

ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹنا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھکا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی کیملی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر، جیسے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کہیں میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم ختم ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رقعہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی بل بل کر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کیفے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا ہار تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کر دے یار پری..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر..... مگر، تو نے بھی بڑا مڑ دوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔“ میرا سر تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اُس رات ماجد کو تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپائے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تمنا بننا دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے یہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ ”تو کیا وہ خط تم نے ناہید ہی کے لیے لکھوایا تھا؟“ ”ہاں یار! اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگائی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھوا کر اُسے دوں گا۔“ میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ”مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ تمہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی.....“ ماجد نے کھسیا کر قبضہ لگایا۔ ”وہ سب بھی نہیں ناہید کے کہنے ہی پہ کہتا تھا، تو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چلتا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پڑو نے آکر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔“ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی ذہن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کیفے کا ایک بیکر اب آ رہا تھا اور ماجد سے بولا۔ ”آپ کو اندر بلاری ہیں۔ کبھی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیفے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ”امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی کہہ سکا کہ کم از کم مجھے توجہ بتا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، جب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سبھی شک نہ ہو۔ آپ تو اباجی کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور میں پتہ ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا وہ رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وہیں گر گیا۔“ ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جاتے تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ ”دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب اتانے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جاسکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔“ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بہ یک وقت کئی شے پھٹنا پھٹنا رہو گئے اور میں ننگے پاؤں ان کمرچیوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

پتا نہیں، میں نے اُس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاتعلقی اور بیگانہ سا انسان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی ویرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، بھٹک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خوف ریزیوں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ محلہ ماجد کے قتلوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن سُن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر بیکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی گمراہ مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بد صورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینیٹن میں اور کالج کی راہ داریوں میں مجھے پھر سے اسی تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جیسے اور حقارت بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس جھمکی سے بار بار چھٹنا ہوگا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات نور تھائیئر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب وغریب تخلص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ ”اے او

چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالوں کے درمیان تقریری کا مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتی الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فاضل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکر کر بیٹھا رہا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرم کر دیا، مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پسپا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلنے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشہ کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے۔ ناساز دھیرے سے مسکرایا۔ ”تم اگر دھیان سے دیکھتے تو یہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ناپائی جاتی۔“ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد۔۔۔؟“ پل بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ”مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی۔۔۔؟“ ”کیوں۔۔۔۔ تم سے محبت کیوں نہیں کی جاسکتی۔۔۔؟“ میں چپ رہا۔ ناساز سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔ ”شاعری پڑھتے ہو۔۔۔؟“ ”ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔“ ناساز نے نصیحت کی۔ ”شعریاد رکھا کرو، صنف نازک پر پڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا۔۔۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”نصیر نیازی کو پڑھا کرو۔۔۔ اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کرلو۔“ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔ ضروری بات کہنی ہو۔ کوئی وعدہ نبھانا ہو، اسے آواز دینی ہو۔ اسے واپس بلانا ہو۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔ کسی کو موت سے پہلے۔ کسی غم سے بچانا ہو۔ حقیقت اور حسی کچھ، اس کو جا کر بتانا ہو۔ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔ میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رونا بھی لگایا۔ ”بس۔۔۔۔ اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے پر نظم دہرائی ہے۔ میں تمہیں چند اور اشعار انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروا دوں گا۔ کیا سمجھے۔۔۔؟“ میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعرو شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماحد کو بھی بہت سے شعریاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروا دیں اور پھر جس دن میں نے بزم ادب کے چیریڈ میں کھڑے ہو کر ”محبت اب نہیں ہوگی۔۔۔۔ یہ کچھ دن بعد میں ہوگی۔۔۔۔ گزر جائیں گے جب یہ دن۔۔۔۔ یہ ان کی یاد میں ہوگی“ سنا تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کہی بات بچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا۔ اور مجھے کالج کی بزم ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا سہا سہی، مگر ایک چھوٹا موٹا شاعر بننے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھپکنے لگا۔ ناساز کسی مجھے ہوئے استاد کی طرح میری ”شاعرانہ تربیت“ کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔ ”یہ کیا غالب اور میر کے رٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں۔۔۔۔ کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرائے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہوناں۔۔۔۔ میں ”پل دوپل کا شاعر ہوں۔۔۔۔ پل دوپل میری کہانی ہے“ والا۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔ کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔“ میں اور میری تنہائی۔۔۔۔ اکثر یہ باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ تم ہوتیں تو کیسا ہوتا۔۔۔۔ تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں۔۔۔۔ میں دے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کر رہا ہے، اس ”ایک“ کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کباڑیے کی دکان کے منیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پیاٹو پڑا تھا۔ کباڑیے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔ ”خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔“ میں نے اپنی جیب دیکھی، دوسواہی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کباڑیے سے کہا۔ ”ایک دن ضرور خریدوں گا۔۔۔۔“ ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھپکنے سے رک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

بائیں ہم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو کبھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی، بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا رگزمت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گرو روڈ، کراچی۔ ای میل: sundaymagazine@jangugroup.com.pk

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر برا سامنہ بنایا اور اماں کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔ ”اے بہن آنا ضرور..... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضیاں پالنے کے شوقین نہیں۔“ ان کے جانے کے بعد بُرا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہو گئی، انہی کی معافی کا پیغام دینے آئی تھی یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے محلے کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ تُو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاؤ.....“ میں اماں کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتا دوپر کرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر دل بھجھ سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ ”کیا بات ہے پیارے! آج کچھ کچھ تجھے سے دکھائی دے رہے ہو؟“ میں نے قریب پڑا آنکراٹھا کر دو رتلا ب کی طرف پھینکا۔ ”تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جگمگاتے دیکھا ہے؟“ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”جل تو رہے ہو اور بڑی شدت سے جل رہے ہو، مگر یہ جلن اندر ہی اندر رکھ کر دینے والی ہے۔ بتاؤ گے نہیں، کب سے سلگ رہے ہو؟“ میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتادی۔ ناساز نے سُن کر ایک سردی آہ بھری، پھر کسی بزرگ کی طرح بیٹھ کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ”تم مجھ سے ایک وعدہ کرو، آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے کہ یہ جیون اس مَن کی مار کے بغیر صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگن لگی رہنی چاہیے۔ انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کروا جاتی ہے یہ تڑپ، یہ جلن..... عام طور پر آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عمر سِلن سے بھری نم زندگی گزار دیتا ہے، مگر جلتے کے لیے ماچس کی رگڑ میسر نہیں آتی۔ اس لڑکی سے ناکام محبت نے تمہیں وہی رگڑ دے دی ہے، اب خل گئے ہو، تو خود کو کچھنے مت دیتا۔“ اُس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں آئی، مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب مہذّر میں آخر کار فنا ہونا ہی لکھا ہے، تو پھر یہ کُجھ کُجھ اور سلگ سلگ کر جینا کیسا؟ جیز جیز کتنے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہو جانے ہی میں مزہ ہے۔ میں بھی اُس روز کے بعد کچھ ایسا بخلا کہ اندر سب کچھ بھسم ہو گیا۔ بس میں، میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کچھ باقی رہ گیا تھا زندگی میں۔

اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سند دے ہی دی، تو وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔ ”اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا“ میں ہنسی پلکوں کے ساتھ اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹنے دیکھتا رہا اور پھر، بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ کالج کے فاسل ایئر سے قبل ہی، پہلے ابا اور پھر اماں یکے بعد دیگرے چل بے، پر مجھے پہلی بار تپسی کا احساس اُس وقت ہوا، جب بھائی بھابھیوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کا حکم صادر کر دیا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں کلرک یا چپڑا ہی کی نوکری پکڑ لوں تاکہ میرا بوجھ ان کے کاندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر ہی لیا کہ کسی سرکاری نوکری کے ملنے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کر دوں گا۔ تب تک شام چپ کر لگدن ہو چکا تھا۔ کالج میں بھی فاسل میں، میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادبی پروگراموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک انجمرتے ہوئے نوجوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا، لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی کرتے تھے، ہاں اگر کچھ نہیں بدلاتا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر، البتہ اب لوگوں کے رویے میں اتنی منافقت ضرور آگئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ ہی پر ہنس دیتے تھے، مگر اب تہتہ میرے پلٹ جانے کے بعد چھوٹا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں بھی، جب مجھے لیکچر ہال کے ڈائس پر بلایا گیا، تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ ”ارے! تو یہ ہے پُری زاؤ.....“ ”آئے ہائے..... سارا مزہ کر کر اکر دیا“ ”شاعری تو غضب کی کرتا ہے، مگر شخصیت..... تو یہ تو بے.....“ ”نہیں نہیں، یہ پُری زاؤ نہیں ہو سکتا، یہ تو کسی فیکٹری کا فوریٹن لگتا ہے۔“ میں یہ ساری سرگوشیاں اور فخر سے سُنے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ڈائس پر آ گیا۔ کلاس پر ایک سکوت طاری تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف تین مصرعوں پر اکتفا کیا۔ ”قصے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے..... آدکچھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے..... شاید یہ ظرف ہے، جو خاموشیوں ہوں اب تک..... ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے..... سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن..... کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں

سارے.....؟ اور بس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈاکس سے اتر آیا، گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے بھی میری بد صورتی سے سمجھوتا کر لیا، مگر، میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو من کرنا کوئی تیز دھار خنجر ہے کہ اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ روگی دل نکال کر اس کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا سینے میں جڑنے نہ پائے، مگر پھر میرا سدا کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطائی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی اک پیار بھری نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر..... جو صرف میرے لیے ہو۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس، بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا اتنی ہی مشکل اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے ہی پر ساری زندگی خود کو ملامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر، خوب روؤں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے مشکوٰۃ میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

اُس روز بھی میں یونیورسٹی کی ایک سُنان راہ داری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سرو پا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ”مستر پُری زاد.....“ میں نے رُک کر دیکھا، انگریزی ڈیپارٹمنٹ کا ایک سینئر سال کا کھانا اپنے دو، تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جن میں شعلہ جوالا قسم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ ”آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پُری زاد ہیں ناں، میرا نام حتام ہے، یہ باسط اوریہ ہماری دوست لیتی۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔“ ”جی فرمائیے.....“ میں نے کہا تو حتام کے بجائے لیتی ہوئی۔ ”دراصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم ٹیکسیٹر کا پلے، پر فارم کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں اجازت اسی صورت ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شواردو ترحے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کر دیں گے.....؟“ میں نے ان تینوں کے تجسس چہروں پر نظر ڈالی۔ ”کوشش کروں گا کہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے۔“ وہ تینوں خوش ہو گئے اور باسط جلدی سے بولا۔ ”اوتھیلو (OTHELO)“۔ ”ٹھیک ہے، آپ لوگ تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتا دوں گا۔“ ان تینوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ ”گریٹ“ اور جاتے وقت بڑے پُر جوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ لیتی سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لِرزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترحے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حتام گروپ کی تلاش میں نکلا تو پتا چلا کہ سارا گروپ آڈیٹوریم میں ڈرامے کی ریبیرسل میں مصروف ہے، میں چپ چاپ ہال میں داخل ہو کر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں گلابی سی ٹائل روٹی بھیلی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے مگر لیتی کی اداکاری الگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گروپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے خوب جم کر داد بھی دے رہا تھا۔ لیتی ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیروئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس لے کر سر ڈھکا یا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو گیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور زور سے چلائے۔ ”ارے..... تم ہو پُری زاد..... آؤ، اسٹیج پر آ جاؤ.....“ حتام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لیتی کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”نہیں، ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پا رہی۔ میرا خیال ہے کہ جب ہیروئن کی موت ہو تو اُس وقت کچھ اشعار یا کوئی غم گین نظم ضرور اور لپ ہوئی چاہیے..... تب ہم تھینا پورے ہال کو رونے پر مجبور کر دیں گے۔“ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلب، جو اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں، بریسلس اور ایک جانب بے پروائی سے چھینکے گئے مہنگے بیگز اور جینز جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی پتلون سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل امارت کی بھی اپنی ایک خاص چکا چوند ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور غربت..... سات پردوں میں بھی ٹھہی ہو تو، شناخت چھپائے نہیں چھپتی۔ لیتی کی کچھ انگریزی میڈیم سہیلیوں نے اسے گھنی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لیتی نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے رویتے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں نے لیتی کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کر لیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریبیرسل شروع کر سکتے ہیں۔ حتام نے مجھے بھی ریبیرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تلفظ کی جانچ بھی کر سکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں گھٹی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا، ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا، تو مجھے لیتی کی بات یاد آگئی کہ اگر لڑکی کی موت کے پس منظر میں کوئی درد انگیزی نظم ہو تو تار دو بالا ہو جائے گا۔ ”اوتھیلو“ کے اختتام پر ہیرو کسی رقیب کی لگائی ہوئی شبک کی آگ میں مجلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیروئن کو لگا دیا کہ مار دیتا ہے اور پل بھر کی نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو گل لگاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا امرت گھڑی بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکنے کے دو رخ ہیں۔ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یک سا رہتا ہے، مگر جب کسی انسان کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، جگہوں، یادوں اور ایک دوسرے سے جو بے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار والے ایک ساتھ چلے تھے، وہ راستہ کیوں علاقہ ممنوعہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بیٹج، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ چائے والا، جس کے ایک کپ میں دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، صفحوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیم کی خالی شیشی، بجی ہوئی آدھی لپ اسٹک، ایک کھوپا ہوا کف لنگ، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پتے، وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی کھٹارا سی بس، درخت کے نیچے کھڑا وہ لیوٹ پانی والا..... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں دو قطبی اس کڑا وہٹ سے کیا تعلق.....؟؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں۔ انسان کتنا غلام ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔

ڈرامے والے دن ہال کچھ بھرا تھا۔ ساری یونیورسٹی اوتیلو کو اردو میں بیٹلے بولنے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور..... ہیروئن کی آخری سانس نکلنے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں۔ سنو، تمہاری وفا پر..... گرچہ پورا یقین ہے، مگر..... بدلتی رزقوں کے وار کا، کچھ مجھ و سنا نہیں..... سو، مگر کبھی ایسا ہو کہ..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے..... اور میری روح کی کوئل بچھڑیاں..... تمہیں کسی بیول کے مانند مجھے لگیں، تو..... بیٹے دنوں کو یاد نہ کرنا..... کہ یادوں کا زہر، زخم کو بھرنے نہیں دیتا..... ہاں مگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے گتھوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں..... کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں..... اور کسی کم نصیب کی بے رحمی سے..... ان باتوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈرامے کے منظر میں اوتیلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن (ڈیسنڈی مونا) سو رہی ہے۔ اوتیلو اپنی محبوبہ کو جگا تا ہے اور سر دلچھے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اوتیلو کی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج کی رات چھینے دے، پھر چاہے تو صبح مار ڈالے، مگر اوتیلو کی آنکھوں پر شکر کے کالے ناگ کس کرچی باندھ چکے ہیں، وہ کہتا ہے ”اب بہت دیر ہو چکی.....“

پس منظر میں نظم کے بول اور لپ ہو رہے تھے۔ اور سنو، میرے محبوب..... کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا..... جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے..... کہ نگ تو روح کو اجالتے ہیں..... اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے..... ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈیسنڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اوتیلو کو بیٹھنے کیوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوتیلو کے ہماری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شرگ کو دبا نا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس گھٹنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور بستر کی چادر نیچے کر جاتی ہے۔ اسے میری وفا کے مالک..... کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے..... کہ نظارے تو قدرت کا خُسن ہوتے ہیں..... اور کسی حرام نصیب کی بدصورت یادوں سے..... ان نظاروں کا کیا لینا دینا.....؟ اوتیلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ بن پانی کی چھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اوتیلو کی آنکھیں وحشت سے باہر کواہل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیسنڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اوتیلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔ میرے ہم نفس..... میری جان..... بس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت نہ کرنا..... کہ میری روح کی سیاہی سے ہی..... یہ چاروں اندھیرا ہے۔ اوتیلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری ہنگی لیتی ہے اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کے بے جان گھٹلی آنکھیں اپنے پیارے اوتیلو کی کوئی دیکھ رہی ہیں، لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اوتیلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے اور اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد چند لمحوں تو سارے ہال میں سا سا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ بس..... لٹنی راتوں رات سارے شہر کی یونیورسٹیوں میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کامیابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے میری ایک نہیں سُنی اور مجبوراً مجھے اُس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغچہ، جس کے درمیان پر یوں کے گھر جیسی ایک شان دار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سونگ پل تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا بہنام بھی تھا۔ لٹنی کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ کھینچ کر کہا۔ ”خوب..... تو یہ ہے پُری زاد.....؟ انٹر سنگ۔“ میرا جی چاہا لٹنی کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلائی جاتی ہے، پھر مجھے خود اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بھکی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ”افاہ..... تو یہ ہیں مسٹر پُری زاد..... جن کی شاعری ڈرامے میں ڈب کی گئی تھی، بھئی واہ لٹنی، کہا اداکاری کی تھی تم نے.....“ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بچی عمر کا مونا سا شخص آہستہ آہستہ ڈگمگاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لٹنی نے تعارف کروایا کہ ”یہ سیٹھ عابد ہیں، ان کے خاندانی دوست۔“ وہ شخص لٹنی سے بہت بے تکلف ہوئے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لٹنی کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر چلنا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ ”اور جناب! کیا مصروفیات ہیں آج کل، دراصل میں خود بھی چھوٹا مونا شاعر ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھندہ ہی جان نہیں چھوڑتا۔“ سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں بھی مجھے سنائیں، جنہیں سن کر میں نے ٹھکرا کر اس کی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی جھن میں گن بولے جا رہا تھا۔ ”لٹنی! تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنو اگر اسے بھی ایسا بتادو کہ وہ لٹنی کے معیار پر پوری اتر جائے۔“ میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور اس کام کے لیے میں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لٹنی بتا رہی تھی کہ تم ٹیوٹنر پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرتے ہو۔“ میں اپنے فستے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ”معاف کیجیے گا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔“ عابد طنز یہ انداز میں مسکرایا۔ ”غلط..... آج کل سب بکاؤ ہے اور جس محفل میں آج تم کھڑے ہو، ان اُمراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ محض ایک شام بہلانے کے کام آتے ہیں۔ ذرا خنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے روڈی کے بھاؤ پکتے دیکھے ہیں۔“ میں لٹنی سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑیا کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ کبھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لٹنی تو ان جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بھٹکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

اگلے دن لٹنی نے مجھے یونیورسٹی میں پُچھ اور اُداس دیکھا تو اُسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اُس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے اسے تسلی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سُن کر اُس کی سیوا جھیل سی آنکھوں میں اُداسی اتر آئی۔ مجبوراً اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دہرائی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھرا ایسی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ بس ایک کی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا پیاؤ نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی چوٹیشن میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لٹنی نے اچانک یونیورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بچنے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے لٹنی کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سنگ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس لٹنی کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھکا مجھے لٹنی کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو دیکھ کر لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راہ بھاڑ کر بولی۔ ”لٹنی سے ملنے آئے ہو؟“ میں نے شیشا کر جواب دیا۔ ”جی،“ لٹنی کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”محبت کرتے ہو، میری بیٹی سے.....؟“ مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لٹنی کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، نملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھاپ ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے آن گت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر: ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

لہٰذا مایا کی بات سُن کر چند لمحوں کو تو میں لنگ سا رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”جواب دو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لہٰذا سُن کر مجھ سے نفرت کرتے ہو۔“ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حالت پر ترس آ گیا۔ ”اندر چلے جاؤ، وہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔“ میں تیز تیز قدم اٹھا تا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لہٰذا ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب اُداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک پچھلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ”پری زاد کیسے ہو؟“ میں نے چھوٹے ہی سوال کیا؟ ”آپ اتنے دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔“ لہٰذا میں نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ”ہاں..... میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ ممانے میری شادی طے کر دی ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟“ ”سیٹھ عابد کے ساتھ۔“ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔“ یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔ ”سیٹھ عابد سے مگر، آپ اور وہ، میرا مطلب ہے، آپ کے لیے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔“ لہٰذا پچھلی سی نم ہونے لگیں۔ ”بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد۔ اونچی بولی کی ہے، جو بھی میرے لیے اونچی بولی لگائے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں جھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی۔ میری نیلای میں اس سے اونچی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔“ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ ”بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لہٰذا جی، شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رخصت ہوتی ہیں، عزت کے ساتھ۔“ لہٰذا میں نے ایک آنسو ڈپکا۔ ”تو پھر یہی سمجھ لو کہ میں بھی وہیں سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بولیاں لگتی ہیں۔ رخصتی نہیں ہوتی۔“ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ”ٹھیک کہہ رہی ہوں اب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد۔ پندرہ دن کے بعد میری دنیا دکھاوے کے لیے وہ رسم بھی ادا ہو جائے گی، جسے یہاں رخصتی کہتے ہیں۔“ لہٰذا میں نے آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عالی شان گھر، یہ رہن بہن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم..... یہ سب دکھاوے پر ہی زاد۔ ہماری یہ شان و شوکت ان ہی سیٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بازارِ حسن کہا کرتے تھے، اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پچھلے کرشروں کی ان اونچی اور اعلیٰ تہیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں، پتا نہیں، وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد ٹکڑہ ہوگا۔“ لہٰذا بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، سو، وہاں کے لے قدم اٹھا دیے کہ عقب سے لہٰذا کی آواز آئی۔ ”میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کہ تم ایک سچے دوست ہو۔“ میں نے پلٹ کر سر جھکائے سیاہ لباس میں ملبوس، ڈھلتی سُرمئی شام جیسی لہٰذا کے وجود کو آخری بار اپنی دُکھتی آنکھوں کے آئینے میں مویا۔ اس کے گلابی عارض آنسوؤں سے ڈھل سے گئے تھے۔ ”لہٰذا جی..... کاش! میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیانو پر بیٹھ کر جڈائی کا گانا ہی گا سکتا ہے۔“ لہٰذا میں نے ہونٹوں پر میری بات سُن کر ذرا دیر کے لیے ایک ہلکی سی مسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں لیے پلٹ آیا۔ لان میں فوارے کے قریب کرسی ڈالنے لہٰذا کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے واپس جانا دیکھ کر فون کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری آواز نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔ ”سُلو لڑکے! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو، تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بڑی عورت ہوں، مگر تمہیں ایک بچے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رُتبہ اور عہدہ پر کھتے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب، ہر خاں کی پروردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔“

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں ملک کے معروف صنعت کار، سیٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے بے زاری سے اخبارات یونیورسٹی کی لائبریری کی میز پر بیٹھ دیئے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لہٰذا کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچ، الفاظ، اعلیٰ خیالات اور ادب و فن، سب کسی کام کے نہیں۔ دمڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں ان ہی خیالات میں گھرا گھرا آیا تو دونوں بڑے بھائی اور بھابھیاں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے ”ہاں میاں..... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ اب تمہاری ان شام کی دو ٹیوشنوں میں گزارہ نہیں ہوتا۔“ دوسرے بھائی بولے۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کہیں کلنگ لگ جاتا ہے۔ وہی کلری ہوگی اور وہی مینیجر کے پانچ سات ہزار۔“ بھابھی نے مشورہ دیا ”میری ماں تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو۔ بچی، سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے اپنے بچوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عمر کے محلّے کے سب لڑکے لو کر یوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے

ہیں۔“ میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے، بیٹے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیریل ضرور چلتا تھا، مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا رو بار میری کمائی کی وجہی سے زکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کر دوں۔“ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھے جیسے جانے کتنے، نوکری کے لیے برسوں جوتیاں منگاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو، جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا کبھی کبھی شرط اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت..... مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی منتر بھی تو نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویڈیو گیم پر لگا ہوا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لاکر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فائل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلٹوں گا۔ شوکی کے گیارہ بجے کا پتا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گیارہ بجے کے گیت پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا، تو لڑکا شوکی کو بلانے اندر چلا گیا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ گیارہ بجے کے گیت کے اوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا ”استاد مستانہ ویڈیو گیم راج“ لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا۔ ”ارے..... پُری زاد بھائی آپ، یہاں..... سب خیر تو ہے؟“ میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گیارہ بجے میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔“ شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”آپ، یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھ لکھے ہو پُری زاد بھائی۔“ میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں گڑے شلوار میں ملبوس اوپر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موہیے کا کھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چڑے بال ایک جانب سلیپے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح دار مونچھیں، دونوں جانب سے اوپر اٹھی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دیر سے سے گنگناتا ہوئے بولا ”وہ آئے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے..... میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟“ شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ ”یہ پُری زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔“ استاد مستانہ پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔ ”اگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔“ استاد مستانہ میری بات سن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا میاں..... شاید تم بڑا امان گئے۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو.....؟“ میرے بولنے سے پہلے شوکی بول اٹھا ”پُری زاد بھائی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں استاد۔“ استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟“ ”ہاں، ایسا ہی سمجھ لیجیے۔“ مستانہ استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی، ”ٹھیک ہے میاں..... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔“ میں نے آستینیں چڑھائیں۔ ”آج سے استاد۔“ رات دیر گئے، میں گھر واپس پہنچا تو حسب معمول میرا انتظار کیے بنا سب سوچکے تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیئے اور صبح سویرے منہ اندر سے پھر سے اٹھ کر گیارہ بج گیا۔ استاد مستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق، اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر تو کھینچ لیا تھا، لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مسٹر بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کا فن کار ابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک ہر فن فلم کا پہلا شو، پہلے دن دیکھنے کا قائل تھا اور پھر فلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تہرے جاری رہتے۔ ”کیا خاکا کیٹنگ کی ہیر وٹے، ہاں وٹے نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا..... نہ میاں! موسیقی کا تو بیڑہ غرق ہی کر دیا ہے، ان نئے لڑکوں نے، اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہو گئی ہے، ٹو فلانے کا باپ، میں فلا نے کا بیٹا، بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو تب ہوا کرتی تھی۔“ چاہیے آپ کہاں جائیں گے، نیک فلورٹ کے پھر آئے گی..... تیرے میرے سننے اب ایک رنگ ہیں..... عجیب داستان ہے یہ، کہاں شروع، کہاں ختم..... واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔“ استاد مستانہ گھنٹوں ہولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد چپ چاپ اس کے تہرے سننے رہتے۔ مجھے استاد نے ویڈیو گیم پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل ٹیگھر دیا۔ ”دیکھ میاں! یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور پھولیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن ہی میں تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے سننے شگاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے گھٹلے حصوں پر انگاری کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہوگی، مگر پھر دیر سے دیر سے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگہوں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔“ اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر رکھ ہو چکے ہوں، ان کا بھلا یہ بھڑکنے آگ کیا باگڑے گی؟ اور پھر جلنے کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حسوں کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھلچھڑی۔

یونیورسٹی کا فائل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے ہی ڈالا۔ حالانکہ اب مجھے ڈگری لینے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگوایا اور ایک دن گیارہ بجے میں بیٹھا اسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ چھپ کر اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اُس کی آنکھیں گھل گئیں۔ ”ارے واہ میاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ بھئی کمال ہے، بتایا کیوں نہیں پہلے؟“ میں نظریں چرا گیا۔ ”اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا؟“ ”کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیہوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع، دوسرے سے بڑھ کر، استاد نے ویں باہر سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈالوائی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔“

میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پڑی نمائندہ کے کواٹھنے کی تک دو میں دلچسپی تھا، مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا، جیسے شعلے کو بھی مجھ سے کوئی ہیر ہو گیا ہے۔ جب انسان کا وقت نہ ہو تو ہر چیز اپنا تاثر کھودیتی ہے۔ شبنم آگ لگنے لگتی ہے اور شعلے سرزد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری میں فلواد کاٹنے کی لا حاصل سعی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ تپش تمہارے اپنے اندر ہے، جو ہر پل تمہیں جھلساتی رہتی ہے۔ پڑی زامیاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو، آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔“ میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”پیرا..... مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر خافی کا علاج صرف پیسا ہے استاد اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسا کمانا ہے۔“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”پر، اس روزانہ کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دن رات محنت کرو، تب بھی مہینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں چندہ میں ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہوگی اور تمہاری نظر الگ جواب دے جائے گی۔“ میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ”تو پھر میں کیا کروں..... مجھے بہت پیسا کمانا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر داغ، ہر عیب بھسپ جائے۔“ ”اگر تم پیسا کمانا چاہتے ہو تو وہی چلے جاؤ، وہاں اس ہنر کی بہت مانگ ہے، اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کمال کو گے۔ کم از کم اپنا گیراج تو کھول ہی سکو گے۔“ میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں، یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔ ”استاد! کیا تم مجھے وہی سمجھا سکتے ہو کسی طرح؟“ ”وہی جانتا آسان نہیں ہے میاں۔ ویزا، ٹکٹ اور قدم بھانے کے لیے متن چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر آگے تمہاری قسمت کے تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں۔“ اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ آخر، ہمارے مقدور ہر فیصلہ کا غد کے ان چند ٹکڑوں ہی سے کیوں مجبور ہوتا ہے، لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کالج اور یونیورسٹی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پزیرائی میں شہر کے دانش ور شاملین منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جگٹے میں سر ہا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پبلکس بھینکتے لگیں، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضاء جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں، تب یہ ہیوٹا تھا اور اس کی روح سے بچنے کی طرح ڈور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روح سے بچنے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف کیمپنیز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چوکیدار نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ وہ ایک بار استقبالیے پر جا کر اسے اندر بھجوا دے، اگر انکار ہوا تو میں گیٹ ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمحوں سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلایا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیٹھ عابد نے سگار کا ایک لمبا ساکس لیا اور طرزیہ انداز میں بولا۔ ”کیوں، میں نے کہا تھا ناں، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہیے، تو بولو، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔“ میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے وہی کالٹکٹ اور ویزے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ دے سکیں تو.....“ سیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے تو لا اور پھر ورق گردانی کی۔ ”ٹھیک ہے، شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔“ میں نے اس کباڑے کو غور سے دیکھا۔ ”آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔“ سیٹھ عابد کے ہونٹوں پر جی طرزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ”واپس لوٹا بھی سکو گے یا وہی جا کر غائب ہو جاؤ گے.....؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات دستخط کروالے گا۔ تمہارا وہی کالٹکٹ اور ویزا میرے ذمے رہا۔“ میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچایا تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”لنٹی اب بھی کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہوگی۔“ میں نے دروازے کا پینڈل گھمایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔“ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

مستانہ استاد حسب معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کاناں سے لگائے کھڑا تھا اور عالم گیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ”آؤ میاں آؤ! کہیں تمہارا دل بھی تو اپنے استاد سے ٹھہر نہیں گیا۔ آج کل گیراج میں بھی دل نہیں لگ رہا تمہارا۔ ناغہ پر ناغہ کرنے لگے ہو۔“ میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ ”استاد! میرے وہی جانے کا بندوبست کر دو ٹکٹ اور ویزا لگوا لیا ہے میں نے۔ وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو بتاؤ۔“ استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے لپک کر مجھے سینے سے لگالیا۔ ”واہ! خوش کر دیا پیارے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے..... کب جانا ہے؟ میرا ڈور کا ایک برخوردار ہوتا ہے وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں آکیلا ہے، کئی سال سے..... رفیق نام ہے اس کا۔“

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے، جیسے چار پل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک لطفیں اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سامان باندھے انٹرپورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا، مگر یہ بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حقائق سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاز نے وہی انٹرپورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ انٹرپورٹ سے باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ”جعلی ویزے پر وہی آئے ہو، جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے.....؟“

(جاری ہے)



.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، نملک کے معروف و منفرد راما راسٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے آن گت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر: ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

e@janggroup.com.pksundaymagazin

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں گنگ ہی رہ گیا۔ دیار غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل ہی سے سلاخوں کے پار آتے ہیں۔ سینٹھ عابذیہ شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے، اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی ویزا ای گلو کر دیا ہو؟ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بد صورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں اپنا ویزا الگا پاسپورٹ سینٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا، تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”الٹنی تمہاری شاعری کی عاشق ہے۔ سچ پوچھو، تو اگر میں نے تمہیں نہ دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کر لیتا۔“ اب میں اسے کیا بتانا کہ رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر بہر حال سینٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید.....؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔ ”اویار! تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستان کا بھانجا۔“ میں نے چونک کر غور سے اسے دوبارہ دیکھا۔ استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یک سر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری الجھن سمجھ گیا۔ ”ارے یار..... استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں فیکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، لاغر اور ناکارہ سامنہ بسورت لڑکا۔ مگر یہ دہی ہے پیارے۔ اچھے اچھوں کی کاپیٹ دیتا ہے۔ اب مجھے تو دیکھو۔“ رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھچی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد، بھرا ہوا جسم اور کھلتی رنگت، کون کہہ سکتا تھا، یہ وہی پرانا فیکا ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دہی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے آتا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ ”بہت اچھا استقبال کیا تم نے، جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔“ وہ زور سے ہنسا۔ ”معاف کرنا یا راندنا اپنی پرانی عادت ہے۔ وہ تمے اتر پورٹ کے اس کو نے میں جس طرح سبے، ڈرے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دہی آئے ہو۔“ ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دہی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ملنے کے لیے طے ہوئی تھی۔ اتر پورٹ پر ایک نہ ختم ہونے والی بھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد و زن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان جانی منزل کی طرف رواں تھا، مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کر دینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا ہجوم بھی خود کو کھودنے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر اتر پورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف فہمیں کر رہا تھا۔ ”یہاں کے عرب بڑے مغرور اور اچڑ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خبط ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہی کو خطا وار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بٹھا کر واپس پاکستان روانہ کر دیں گے۔ مجھے بھی ایک غم ہوگیا، ان کے ناخبرے اٹھا تے اور ان کا خبط برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری سبھی اقوام کو یہ اپنا خدام تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر مل ان کا غلام بن کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا دماغ ہمیشہ شہنشاہ رکھنا۔“

رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں سب اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیکھ کر کھیل تماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہو جائے گی تو وہ اپنے خیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلے بنیں گے، جیسے ساحل پر کھینچنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں، تو جاتے جاتے بیروں سے اپنا ہی بنایا شہر سمار کر کے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دہی بھی ایسے چند شرارتی بچوں کا بنایا ہوا عارضی بسا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جارہا تھا، میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھر کر رفیق سے کہا۔ ”گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی ہے کیا؟“ رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”نی الحال نہیں، مگر ایک دن اپنی بھی ہو جائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیور کی کر کے روزی روٹی کماتے ہیں۔“ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی، جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سے چھوٹے فلیٹس بھی بنے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے، مگر صاف سترے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔ ”فرخ میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کر کے کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات باقی باتیں ہوں گی۔“

رفیق لپک چمک چائے کی پوری پیالی دو گھنٹ میں طلق سے اتار کر ہاں سے چلتا بنا۔ بہت کھلے دل کا تھا رفیق، بالکل استاد مستانہ کی طرح..... مجھے وہ سب یاد آئے، تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دُور وقت نہیں گزارا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے زور فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دُوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اُسی ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے، مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کر ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یادستاں لگی تھی، جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے، تو پھر ہم ان درود دیوار، رشتوں، درختوں اور آس پاس کے ماحول سے اتنا جڑ کیوں جاتے ہیں کہ ذرا سی دُوری خود ہمیں توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے، تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی۔

اگلے ایک دُیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعیراتی کہنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا، فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزا تھا، مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کروا دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمان داری سے اپنا کام جاری رکھا، تو اس مدت میں سال بہ سال تو سب سے بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زبردستی تعیر عمارت کی پندرہویں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے واپسی ہوتی تو عام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر پُور ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا۔ مبینہ بھر بعد جب مجھے میری پہلی تنخواہ ملی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے مُٹھی میں بند تھے۔ مگر مجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا۔ اُس روز رفیق کو بھی تنخواہ ملی تھی، لہذا شام کو اسی خوشی میں وہ مجھے دعائی دکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مالک لایا۔ دعائی کی ڈھلتی شام میں تبدیل ہوتی رات، رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرہ وہ دھلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی، چمکتے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، ہانپوں میں ہانپیں ڈالے، اس دل زبا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام نشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، اس بات کا احساس مجھے اُس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی نچوڑ لینے کو جینا کہتے ہیں، اور ”ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔“ رفیق نے مجھے یوں گم صدمہ دیکھا، تو پُچھ نہ رہا۔ ”کیا بات ہے شہزادے..... کہاں کھو گئے ہو؟ شہر کی رونقیں دیکھو۔“ میں نے فوراً چڑ کر کہا۔ ”ایک تو تم

مجھے شہزادہ نہ کہا کرو، مجھے لگتا ہے، باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”تم تو واقعی برا مان گئے۔ اچھا چلو، میں تمہارا دل بھلانے کے لیے دعائی کے سب سے بڑے کلب لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ ٹکٹ ہی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔“ میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ”کیوں تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے؟“ رفیق زور سے فحش پڑا۔ ”ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹل ہیں میرے مالک کی کہنی کے پاس۔ کوئی حساب نہیں ہے، اس کی دولت کا۔ کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی بیٹھ جائے اور اس ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اڑاتا رہے، تب بھی اس کی تسلیں تا قیامت عیش کرتی رہیں گی۔“ رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کے کنارے دوڑتی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک ظلم جیسا تھا، کئی منزلہ عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پارکنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کی لابی اور اندرونی حصوں کو جدید اور خود کار لفٹس کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریسٹوران، سوننگ پول، گالف اور اسنو کرکٹر، شاپنگ پلازا، سینما، تھیٹر، جوئے خانے، بار، قمار گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کیا کچھ آہٹا تھا۔ کلب کیا تھا، پورا ایک شہر تھا، جسے پچاس منزلہ عمارت میں سودیا گیا تھا۔ چھت پر فٹ بالی نظام اور مختلف سیاروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیویدیکل دُور بینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جاسکتا تھا، کلب میں نو جوان جوڑوں کی بہتات تھی، ہب اور بار اسٹے پُرجوم کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں ٹوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسب معمول ایک جان دار قہقہہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔ ”اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دعائی ایک ہی شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا۔ اب یہ اُس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتاوے۔ عابدوں اور زاہدوں کے لیے مسجدیں کھلی ہیں اور بندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں۔“ ”رند کے رند رہے، ہاتھ سے جُست نہ گئی۔“ تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔“ کلب کی ہر منزل پر خُشن کے جلوے اس کثرت سے بکھرے تھے کہ انہیں اپنی محدود بصارت میں سینٹا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل چیلن دیکھ کر چکرا اُٹھی تو گیا۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اُسی عمل میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر سزا و جزا کا دار و مدار۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانے پھینک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں محسوس سزا و جزا کا ہر فلسفہ بھلا کر بس ان لُحوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کجی کر جاتے ہیں اور کارِ ثواب بھی ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک کلب میں ایک ہل چلی سی جگمگی۔ سارا عملہ ایک دم چاق چو بند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں، پتا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہروز کریم وہاں آ چکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہروز ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سنا سنا سچھا گیا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک نفیس شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہوانا کا قتی سگار، ہیرے سے بنی نائی بن اور کف لکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور پیچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی دشت اور اداسی، کھویا کھویا سا وہ شخص واقعی کسی عظیم سلطنت کا

سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی، ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدرخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا، مگر بہروز کریم پر امارت ٹوٹ کر برستی محسوس ہو رہی تھی، اس کے ارد گرد اسٹاف، فیبرز اور محافظوں کا ایک جھوم تھا، مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شب برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر بونس ملتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود سبھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے ہیں، ان کا ہر بل، ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا سبھی کے لیے دعوت عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سُن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفیق نے موقع غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔ ”یہ میرا دوست پُری زاد ہے مالک..... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم بتایا تم نے.....؟“ میں پُچھ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ”پُری زاد مالک۔“ بہروز کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”خوب، اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے منیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دینا۔“ بہروز مختصر سی بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ”تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے۔“ رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ”دینی میں سبھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دینی آ کر بس گئے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں بات کرتے ہیں۔“

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کامیابیوں کی داستانیں سُناتا رہا کہ کیسے کامیابی کی میزیں حیاں ملے کرتے کرتے آج وہ دینی کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کامیابی سے متعلق بہت سی پُر اسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو سبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجہ بہرے کے پیچھے ایک سفاک شخص اُٹھ چکا ہوا ہے، جو اپنی کامیابی کی راہ میں آنے والی ہر شے کو ہنس کر دیتا ہے۔ رفیق، بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ ”دیکھ لو پُری زادے پیارے..... تمہیں جس نام سے اتنی چڑ ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر دو بارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں نا..... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔“ گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرتا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس گھنٹے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قارون کا خزانہ اور کسی کے ہاتھ خالی کھٹول کیوں ہوتا ہے۔

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری ایریا میں لے گیا۔ منیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے، دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے پیر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”چل پیارے..... تیرا کام تو بن گیا۔ یہ فیبر تھوڑا سا میزھا آدی ہے، مگر ہے مالک کا خاص بندہ۔ اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چلکی بجاتے ہیں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔“ اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سیکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں، جیسی ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد، رفیق نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں تمہارے مجھے خاصی معقول تنخواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے نیچے اٹھ بیٹے اور مین سوئے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگتے اور دن سونے لگے تھے، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ رات کو انسان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُجالا ہماری بہت سی اُن دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے جمید کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

میں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہری میں مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صبح کا تاروں بھرا آسمان، جودرات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا، البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی پٹیاں ایک گودام میں سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا چاہی تو فوراً میں نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر میں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی، تو میں صبح ہوتے ہی منیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ ”میں یہیں ہوں..... تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری جھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لا پرواہی سے ٹال دی۔ ”ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفٹ ختم کر کے چپ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔“ مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اُس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ بہروز خفے میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا اور پھر پچھٹی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکوڑ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا، تو تیزی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتاتا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہ راست مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے سر!.....“ بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، نمٹک کے معروف و منفرد راما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ٹھہری ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے آن گنت بد صورت روقوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

مصطفیٰ نے مجھے بری طرح جھاڑ دیا۔ ”تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں سچ راستے میں نہیں روکا، میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے، کل آکر مینے بھری تنخواہ لے جانا۔“ میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سنی۔ ”ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے۔“ آس پاس کا عملہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے مجھ سے برا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا گار سلگایا۔ ”ہاں بولو لڑکے..... اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہئیں، تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا، اکاؤنٹس والوں سے لے لو۔“ میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ”نہیں جناب..... مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری سے کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں، جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا۔“ میری بات سن کر مصطفیٰ نے ڈانٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ”فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر لے آؤ۔“ بہروز حسب معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے باڈی گارڈ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر بھی پہرہ دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموش یا، شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی شفٹ کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر دوبارہ اپنے اپنے کام میں جھٹ گئے۔ کچھ دیر بعد چڑھائی نے آکر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کے جہازی سائز، عالی شان دفتر میں داخل ہو گئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا، جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سپاٹ سا اثر تھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”تم تو وہی ہونا، جسے رفیق نے بھرتی کر دیا تھا؟ ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے اس رات کا پورا قصہ بہروز کو سنا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا گار کس کش لیتا میری بات سن رہا۔ میری بات ختم ہوئی، تو اس نے ایک گہرا سس لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگایا ہو یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔“ جی..... میں جانتا ہوں، آپ اپنے طور پر تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔“ بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عتب میں مودب کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ”کیوں مصطفیٰ! کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے؟“ مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ”جی مالک..... یہ سچ کہہ رہا ہے۔“ میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت بہروز کریم کا رد عمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے گار کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے مصطفیٰ جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا کہتے جانا۔“ بہروز کو میرا خیال آیا ”لڑکے، تم کافی پیو گے.....؟“ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا کہ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار، لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پروا کیے، اپنی وفاداری نبھائی۔ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا منفرد سا نام تھا.....؟“ بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرایا۔ ”پری زاؤ“ بہروز مسکرایا ”ہاں..... پری زاؤ! میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص پسند نہیں، تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے.....؟“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ”نام بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک..... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلانا رہتا ہے۔“ بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”مرد کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ دہی کس لیے آئے ہو؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بہت سا پیسا کمانے..... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے۔“ بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخی مسکراہٹ لمبے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ ”بڑا آدمی.....؟ جانتے ہو لڑکے، یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتا چلا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی خبر دینے کے بجائے، اس آلودہ نظام کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور

باہر جاتے ہوئے لئے بھرے لیے میرے پاس زکا۔ ”گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹ سے ملنے جانا۔۔۔“ میں اپنی جگہ ٹم ٹم سا کھڑا رہ گیا اور بہرزد کر کے سے نکل گیا۔ صبح بھٹی سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹ میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں تھا گیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بہرزد کریم کی اس سلطنت کا اصل دارو مدار کچھ ایسے ہی غیر قانونی دھندوں پر ہے، جن کی خبر باہر والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر بڑی طرح برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھدے میں ناگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہرزد نے مجھے معاف کر دیا، مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا، تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس بہرزد کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہفتے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کر دی گئی۔ مصطفیٰ نے اب بھی میرا گاہے بگاہے سامنا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں وہ پہلے جتنی سختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کے ذریعے واپسی کا وقت نوٹ کر وار ہاتھ، تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا پیغام دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب ایک شید کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کر کے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کنڈی لگانے کا اشارہ کیا اور اپنے مخصوص کرسٹ لہجے میں بولا۔ ”جتنا کمار ہے، اس پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو۔۔۔؟“ میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ”میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں۔“ مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لال انچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کر کے بہرزد کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیور موجود ہوں گے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جانے بنانا ہی بھری۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ”کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”آپ بے فکر رہیں، میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔“

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی بھپوں میں سوار ڈور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لال انچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ ڈور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نو جوانوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں بکھر جاتیں اور پھر، یہ طویل ستانا ہمیں گھیر لیتا۔ آج 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دینی کے درد دیوار، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے خیموں اور پھولوں سے اٹے دیکھا تھا، نو جوان لڑکیاں سرخ لباس میں ادھر ادھر رنگ برنگی تیلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور نو جوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف یا ٹائی پہننے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! دنیا میں بد صورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں جما رہتا ہے۔ اگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت ہونی چاہیے، کچھ تو ایسا ہو، جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کن انٹی سیدی سوچوں کے حضور میں گھر اٹھا کہ اچانک دو دور سے چند لال انچوں کی مخصوص جلتی بھتی روشنیان نظر آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سنگٹل یا خاص اشارہ تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پائل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا، کچھ دیر میں لال انچیں ساحل کے قریب آ گئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لال انچوں کی طرف بڑھے۔ لال انچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ ویران حصہ بڑی بڑی دیوہیکل سرخ لائٹس کی روشنیوں میں جگمگ سا گیا اور ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے اگرمیزی میں چلایا۔ ”کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔“ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلایا۔ ”بھاگو“ اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرخ لائٹس چمکانے سے ٹوٹ گئیں۔ ایک بھکڑی سی جگہ گئی، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھا جانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گرنا ہوا تھا۔ لوہے کی ایک سرد نال میری کپٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پٹیوں سے ہوتا دماغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ بے ہوشی، شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا، جب شدید خنڈے پانی کی ایک بو چھاڑنے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتار اچھیکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھگٹے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھر در رسی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تار جیسی رسی اپنے ہاتھوں کی کلائیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھیتی محسوس ہو رہی تھی،

مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن رستی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے وہ رستی گردن کے گوشت میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرہ شاید تہہ خانہ تھا۔ میں نے کچھ ہولنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آ کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچا سید کیا اور عربی میں چلا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچا گال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بڑا سٹا کا نہ تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، وہی میں کب سے قیام پر ہوں اور میرا ان انگریزوں سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟..... میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرہ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑے کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص تھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں جھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم کو جلتے سنگریلوں سے وقفہ وقفے سے داغا جا رہا تھا اور اس تمام عرصے میں مجھے پنجوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رستی سے چھت پر ایک کٹڈے کے ساتھ باندھ رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑتا رہے کہ میرے شانوں اور کہنیوں کے جوڑے کھل جائیں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے ہوش ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح نفس غصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جگہاں دوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں میں مری نہ جاؤں، لہذا انہیں اسے سلطانی گواہ بنالینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسناپ پیپر پر ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گروہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں، تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بنا کسی الزام کے ڈی پورٹ کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا، مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اتنے طویل ہونے لگے کہ مجھے دن اور رات کی ہر تمیز اور کتنی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عمر زبان کے گھٹاؤ سبب سے، روح کو بھی اذیت سہنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھٹاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوا لیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے نیچے جھکا تو دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی کی کہ آدھی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں ناس "نیک کام" کو اگلے روز صبح تک مؤخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے علیحدہ ہونے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اُس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بیگانے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جمیلا اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش! اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا.....

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے، مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگلی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گرہ کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دینے کی کوشش کی تو منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اذیت، درد اور تکلیف سے درد پاؤں کے بند گھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ نکلا، جیسے شدید گرمی کی کڑی دو پہر میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ کرسی کی ہتھلی ٹوٹ چکی

ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے اور کانپتی، زخمی، خون سے سنی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح گھینٹے ہوئے سیز جیوں تک جا پہنچا اور پھر، چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سیز حیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کنڈی کی مدد سے باہر کی جانب سے بندھا تھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چھٹی گھل گئی اور میں اپنے ہی زور پر، باہر کھلے ہال میں جا گیا۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک ویران سی مکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ناگوں میں موجود ہر ہڈی کو بیس کر چکنا چٹو کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیرِ تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دُور صحن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ نہیں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک صحن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکا چوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہو گیا اور پھر مجھے بہت سے سائے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی، مگر مجھے راستے ہی میں کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سدھ ساز مین پر گر گیا، جیسے سیکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگا تار دوڑنے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے پُور ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی ناخن سے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری پلکیں جھل جھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آخر کار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے، پلکوں کے در پر اپنے سفید پنکھ پھیلائے آکھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ”پُری زاد..... اٹھو..... چلو بہت دیر ہو گئی.....“ میں نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکار رہا تھا، مگر یہ آواز.....؟ ہاں، میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا ”اے اب ہوش میں لاؤ..... یہ مجھے زندہ چاہیے.....“ میرے ڈوبے ذہن نے آواز پہچان لی..... یہ بہروز کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہروز کریم نے خود اغوا کر لیا تھا؟

(جاری ہے)

بائیں قدم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منکب کے معروف و منفرد راہزن، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سُنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی قلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ٹھہرے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سُنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangugroup.com.pk

بہروز کریم کی آواز سننے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر میں ہوش کی سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا، ”سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں..... سوچو تم نے اور میں نے، کیا پایا انسان ہو کے.....؟“ میں بھی ایک ایسا ہی بد نصیب انسان تھا۔ پیچھی، ندیا یا پون کا جھونکا ہوتا، تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا، مگر میرے پُرتو بندھے ہوئے تھے، جتنی بار ہوش آیا، میں نے خود کو سفید چٹوں میں بندھے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا، تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستر پر پڑا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنارہی تھی، میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں.....؟“ تو وہ مسکرا کے بولی۔ ”فکرت کرو، تم محفوظ باتھوں میں ہو..... تمہارے زخم دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں، بس تم آرام کرو۔“ نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا، میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھا، جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وقفا ہوتے ہیں۔ میٹائی کا مرہم ملنے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے، یہ اُسی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ عُمر بھر ساتھ تو بھٹاتے ہیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفیق کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتا ہی نہیں تھا اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ ”یہ سب کیا ہے فیروز..... میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے، مالک کہاں ہیں، کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا.....؟“ فیروز نے حسب معمول خاموشی سے میرے سارے سوالات سُنے اور پھر بہت اطمینان سے بولا۔ ”سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بہت سخت جان نکلے، ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچھ لڑکا ایک جھٹکے میں ہی ٹوٹ جائے گا۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔“ میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب، تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اور مجھے انوار کے کہاں رکھا گیا؟“ فیروز کا چہرہ پھر بے تاثر تھا۔ اس نے جیب سے اپنی مخصوص براؤز کی بیڑی نکالی اور ہونٹوں میں داب کر سکا۔ ”ہاں، نہ صرف جگہ کا پتا تھا، بلکہ تمہیں یہاں اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے۔“ میرے دماغ کا تو جیسے فیوزی اُڑ گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ”مگر کیوں، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا.....؟“ فیروز کا لہجہ اب بھی دھیمہ اور پُر سکون تھا۔ ”تم ہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت پیسا کمانا ہے۔ یہ پیسا کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں ہٹل تمہا کر دوڑوں یا مال لینے ساحل پر بھیج دیں گے، پیسا کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت، حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں، انہیں اسی طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں، مگر تم پر مالک نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ رکھا۔“ میں منہ کو لے حیرت سے فیروز کی بات سُنا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرائی کو کش تک سب ہی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول دیتا، تو اسی لمحے مجھے اس اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلاح سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فراہم کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہروز یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایسی ساری کارروائیوں کی براہ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے ارد گرد صرف ایسے خاص چٹے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کے ہر امتحان پر پورا اُترے۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلی نہ رکھنے کو کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتا ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوظہبی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس عرصے میں وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کر وادی۔ میری آواز سن کر رفیق کھل سا گیا۔ ”اوئے کہاں ہو تم یا را! ایسی بھی کیا نوکری، یاروں کو ہی بھلا دیا۔“ میری آواز بھرا سی گئی۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں جلدی واپس آ کر تم سے ملوں گا۔ اور پھر فیروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، روپیہ، پیسا، سب کچھ کما لیتا ہے، مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے خلوص اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہروز کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔ سلطنت بنالینے سے کہیں زیادہ مشکل، سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ بہت چھوٹے اور معمولی خاندانوں کے ہاتھوں اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہروز کریم مجھے تاریخ یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہرونی پچلی سی جگمگ، جو بہروز کی آمد کا خاصہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بہروز میرے کمرے میں موجود تھا، فیروز خان بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بہروز نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بستر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ

کر مجھے بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ ”کچھ کہو گے نہیں مجھ سے، میری وجہ سے تم پر ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے تمہاری نفس میں درد کا زہر بھر دیا گیا۔ غصہ تو بہت آیا ہوگا مجھ پر۔“ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ براہ راست بہروز کی طرف دیکھا۔ ”نہیں..... آپ نے وہی کیا، جو دنیا میں کسی کی بھی وفاداری جانچنے کے لیے رائج طریقہ ہے۔ انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے۔ تو اگر آپ نے بھی کم زوری کو آزم کر وفاداری کی جانچ کی تو کیسا گلہ شکوہ.....؟“ بہروز نے دل چسپی سے پوچھا۔ ”خوب! گویا وفاداری پر کھٹے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جانتا چاہوں گا۔“ جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور دردم زوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درستہ اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟“ بہروز پچھ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں حُسن اور کہیں اقتدار، آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزرا رہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے حصے کا امتحان ہی نہ ہو.....؟“ بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لاشر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لڑکے، مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، لیکن ایک بات تمہاری دل کو لگتی ہے۔ واقعی وفاداروں کی وفات اپنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا کبھی۔ انسان کے خون ہی میں وفات نہ ہو تو یہ صرف دل بہلاوے کی آزمائش ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آتی اور مجھے تمہاری قوت برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالانکہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال، اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصہ بن چکے ہو، مگر یاد رہے، جس دنیا میں تم قدم رکھنے جا رہے ہو، وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا، مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر تمہاری واپسی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔“ ”میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنے واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں، اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں، جن کی واپسی کا کوئی منظر ہو۔ میرا کوئی آگے سے نہ پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ بہروز نے اطمینان سے میری بات سنی اور پھر کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ، پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے۔ اور ہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔“ بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا۔ ”تم واقعی بہت خوش قسمت ہو لڑکے! مالک کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندرست ہو کر باہر آنا تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔“ فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا ”اچھا ہوا تم آگئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر ایف بی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا، میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوادے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ میں رہو گے۔“ میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے اور پورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنج میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے، ناتے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ ان ہی جذباتوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا جھان لیتے ہیں، مجھے تو ویسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوبیس گھنٹے بھی اُس فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کھلا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کروادے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرسٹڈ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہاز ساز کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قالین، روشنی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر بنے ہوئے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا میز اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی..... پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بناوہ گودام نما چھوٹا سا کمرہ یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس چھوٹے سے ڈر بے نما کمرے سے لے کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھو یا بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قانون کی نظر سے چُھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ در پردہ سونے کی اس گلنگ کا کاروبار کرتے تھے، یہ دولت کمانا بھی تو ایک خطہ ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خطہ اور جنوں، ورنہ بہروز کریم کو بھلا مزید روپیا کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کچھ لوگ خراج کر کے اس نشے کا سُور و محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے۔ اسی روز مجھے ایک اور ادراک بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور لا پرواہ ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھانگ چار پائی پر بھی جھولنے جھولنے نیند آ جاتی تھی اور آج جب میرے پاس دینی کے سب سے پوش علاقے میں مہنگا ترین اپارٹمنٹ موجود تھا، تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسہری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آ گیا کہ بہروز کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ

کے لیے اپنے ساحل والے بنگلے پر بلایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرائیور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہروز کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہروز کو صرف کمائیاں، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کراختگی ظاہر کرتے ہیں۔ بہروز کریم کا یہ عالی شان محل اس مثال کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہروز کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی، جس سے پرے، بہرے پر ایک وسیع و عریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے ٹھنڈے ختم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب ٹوبوں کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہروز کے بنگلے کی انہیسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انہیسی میں داخل ہوئے تو بہروز اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہروز نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی ہفتہ بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں سبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی، فیروز نے سب کو مختلف ادھورے کام اور وہ سودے بتائے، جو اس عرصے میں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف ہی کھڑا رہ گیا۔ بہروز کریم نے مسکرا کر فیروز سے پوچھا ”کیوں فیروز خان! پڑی زاد سے تمہاری بہت دوستی ہوگئی ہے کیا، اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے؟“ فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا ”یہ ابھی نیا ہے مالک..... اور اسے کوئی پرانا سودا بھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتادیں۔“ بہروز نے اپنا مخصوص رگڑا لگا لیا اور فیروز نے لائسنس اسے اسے سلگایا۔ ”ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے، تم جانتے ہو پڑی زاد تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔“ میں نے سُرھکا کر کہا ”میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔“ بہروز نے مجھے بتایا کہ اس نے محل اپنی چوتھی بیوی کے لیے تعمیر کروایا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔ اس کی باقی دو بیگمات یہیں دعویٰ میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔ وہ لندن اپنے اسی بیٹے کا کسی نام و نقلی ادارے میں داخلہ کروانے کی غرض سے جا رہا تھا، لیکن اُسے اپنی اس نئی کم سن دہن کی بہت زیادہ فکر لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہروز نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو ابھی بہروز کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کریم کی نئی نوٹلی دہن کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہروز کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اب جتنی تھی، لہذا وہ اپنی سہیلیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ بہروز اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہروز کے پرانے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہروز کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہذا بہروز چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے ساتھ جاؤں، دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہروز کی دہن کو کسی گاڑ کی موجودگی کی الجھن سے بے بھی بے خبر رکھوں کہ اسے اس زیر زمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہروز اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، البتہ جس گاڑی میں، میں ڈرائیور اور بہروز کی وہ لاڈلی گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہروز کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ضرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور ان کا منڈو سے فون پر میرا رابطہ رہے گا تا کہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ جھپٹے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہروز نے تقدیق کے لیے میری طرف دیکھا ”سب سمجھ گئے ناں، کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، لیلیٰ صابری جان ہے۔ اسے ہلکی سی کھر و بچ بھی آتی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے پڑی زاد۔“ میں نے سر ہلایا ”نہیں مالک! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔“ بہروز مسکرایا ”شاہاش! تم ظاہر نہیں کرتے، مگر کافی ذہین ہو۔“ میں چپ رہا، مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی، جیسے بہروز نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص مٹھ پالیا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا راز میرے آس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہو، پر بتانا پار ہاں۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آکر بتایا کہ لیلیٰ صابری جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہروز کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تم بھی وہیں آ جاؤ، میں تمہارا تعارف بھی لیلیٰ سے کروا دیتا ہوں۔“ میں بہروز کریم اور فیروز کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس محل کے بال نمالہ لانچ میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوب صورت سفید رنگ کے پیانو کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیانٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیانو دکھایا بھی تو کہاں..... اتنے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی میز جیوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی، میری نظر میں خود یہ خود جھک گئیں، آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے آئی تو بہروز نے مجھ سے کہا ”ان سے ملو پڑی زاد، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیلیٰ صاب۔“ میں نے جھپٹتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک ہل کے لیے بجلی سی گئی۔



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد بیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز تم بھولے گا۔ ہمارا پتا وی پرائیوٹ:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے لیلیٰ صبا کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے پتھر کا ہو گیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے ہی سے نہیں نوازا تھا، لیلیٰ صبا کی صورت کُسن کی ایک انمول نعمت بھی عطا کر رکھی تھی۔ لیلیٰ کُسن و نازکت کا ایک مکمل استخراج تھی۔ مغربی لباس میں ملیوں، سیاہ فلپیر کے اوپر میروں شرٹ اور گلے میں سیاہ اسکارف، گٹلے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمیر..... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رخ کی حفاظت کے لیے سارے دینی کو بھی مامور کر دیا جاتا تو کم تھا۔ کریم نے لیلیٰ سے میرا تعارف کروایا ”اس سے ملو، یہ پڑی زاد ہے، میرا نیا اسسٹنٹ.....“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے نغوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا ”او کم آن آغا، آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟“ بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی ہی میں مجھے لاؤنچ کے ساتھ ملحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ شاید وہ لیلیٰ کو یہ جتنا چاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل آیا، مگر لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز میں بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلنے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا، تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہو گئی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا، اب یہ شخص میرا سایہ بنا رہے گا.....؟“ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بے گارے، اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔“ بہروز کریم نے اپنے مخصوص شندے لہجے میں بیوی کو کھنچا یا کہ میرا اس کے ساتھ جا رہا جا کیوں ناگزیر ہے، اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے، ورنہ وہ پردیس جا کر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہر حال، ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معاملے کی نزاکت سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا رنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فوٹا کو بھی بھر بھری مٹی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مجھے نیا حکم ملے کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انیکسی منتقل ہو جاؤں، تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بد ظاہر یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت میز حاد کھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تصدیق بھی جلد ہی ہو گئی، جب اتر پورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بلا کر تختی سے تاکید کی کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینی ہوگی۔

بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیروز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معتا بھی حل کر دیا کہ دراصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل ہار بیٹھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے۔ یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا، مگر میں بد قسمتی سے پہلے روزی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک نا پسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا، کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے پہرے سے شدید چڑ ہو گئی تھی اور اس کی جھنجھلاہٹ کا سارا نزلہ مجھ ہی پر گرنا تھا، لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماہ رخ کی جھجھجھ صورت شخص سے نفرت لازمی تھی۔ خاص طور پر اُس وقت، جب اس شخص کی ہم سفر کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے۔ مگر ہر گھر میں، ہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر بل میرا راستہ کٹتے رہتے تھے۔ اور گھری پر کیا مختصر، باہر لگی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں کہاں کہاں ان سے بچ پاتا۔ سارے شہر میں جاہ جاہ میرا منہ چڑانے اور مذاق اڑانے کے لیے کھڑے ملتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو، جہاں میں ہاں کسی خوف اور جھجک صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔

اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آکر حکم سنایا کہ مالکن باہر جانا چاہتی ہیں اور ڈرائیور باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صبا غصے میں بھری کھڑی تھی ”اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے، کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا؟“ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا، ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے دی اور جھڑک دیا۔ ”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے، اب گاڑی میں بیٹھو، میں کسی فضول بحث کے موڈ میں نہیں ہوں“ میں چپ چاپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیور سے کہیں چلنے کو کہا۔ گاڑی دینی کی بارونق سڑکوں سے ہوتی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہو گئی، جہاں اونچے اونچے پُر عیش پارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں تھیں۔ ہماری گاڑی ”بے“ میریز کے پارٹمنٹس کی قطار کے سامنے آکر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اترتی تو میں بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ”تم کہاں اتر آئے..... میں نیچے میرا انتظار کرو، میں اپنی سیٹیلی سے مل کر آتی ہوں“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا ”مجھے آپ کو ایسا نہ چھوڑنے کا حکم ہے۔ میں آپ کی سیٹیلی کے پارٹمنٹ تک ساتھ چلوں گا۔“ لیلیٰ میری بات سنتے ہی آپے سے باہر

ہوگئی۔ ”ہاؤ، ڈیر..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ.....“ اس بار مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔ ”معافی چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے“ ہمارے تعاقب میں آنے والے گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ لیلیٰ غصے سے دانت چبیتی، پھر ہنپتی اندر لٹھ کی جانب بڑھ گئی۔ پندرہویں منزل پر لیلیٰ کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اُس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے کے بیچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ لیلیٰ نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اُس کی سٹیلی کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اترتے ہی چیخ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انکسی میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہو گیا ”تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج.....؟“ ”ہاں، وہ اکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔“ فیروز نے ایک لمبی سانس بھری، آئندہ ایسی نوبت نہ آئے، تو بہتر ہے۔ لیلیٰ مالکن، مالک کی بہت چڑیتی ہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ یوں سمجھ لو کہ تم ایک دودھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر رکھنا ہے، ورنہ کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔“ فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہرہ ور کریم کا حکم ماننا تو لیلیٰ کی ناراضی یعنی تھی، اور اگر لیلیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دُور رہتا اور مکمل گھرائی نہ کرتا تو بہرہ ور کی حکم عدولی ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میری مقتدر تھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے ہال سے پیا نو کی مدھرتائیں ابھرنے لگیں۔ کوئی پیا نو پر بہت خوب صورت ڈھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز استانی پیا نو بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیا نو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنچ کی کھڑکی سے ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو اُن کے قدموں واپس چلا آیا۔ گویا لیلیٰ کو بھی پیا نو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوب صورت اور بد صورت لوگوں کے اندر ایک سادہ ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بد صورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک بہرہ ور کریم کی ہدایات پہنچا دی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلنا تو وہ اکیلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک مالز میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا اتنا خبط کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیا نو کی اس خوب صورت ڈھن کی آس کرنے لگے، سماعت کو بھی تو کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت کو کہ جو ساری عمر کی زبان سے دو میٹھے بول سننے کو ترستی رہی۔ اور پھر، ہماری سماعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی بکھیری دیگر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بتتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراہتی ہوا، جھرنوں اور ایسی میٹھی ڈھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سو، جب پیا نو کے لئے چھڑی، تو میں بے اختیار انکسی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں، لاؤنچ کی کھڑکیوں کے آس پاس ٹھیلے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آتا بند ہوئی اور بوڑھی پیا نو ٹیچر سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہرہ ور کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا دی۔ اس کا نام مارتھا تھا، میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیا نو بجانا سکھا سکتی ہے، میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا، مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اپنا پیا نو نہیں ہے۔ وہ تو کرچین کا لونگی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے بچوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیا نو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میری امیدوں پر اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں جھپکیں، ”اگر میں کبھی اپنا پیا نو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی؟“ مارتھا میرا سوال سن کر زور سے ہنس پڑی ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدھی کر دوں گی۔“ مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلٹنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیا نو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق دل گا۔

اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیا نو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انکسی میں پیا نو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دہلی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجب ہے، خواب دیکھے، تو راتوں پر فریب دینے، جال بننے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب نہ آئے تو اُسی رات کی طوالت سے اُسے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا، تو سر درد سے پھٹ رہا تھا بستر چھوڑنے کو بالکل بھی من نہیں کر رہا تھا، مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو چکنا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار جھینٹے مارے اور سوچی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی روٹھ گئی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاق چوہند اور تیار بیٹھے تھے۔

کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنچ میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھا ہوا سالانچ کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی، لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ خلل کثرتِ حُسن کی وجہ سے تھا یا کثرتِ زور کے سبب، کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اندر مافیٰ ثور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہال میں داخل ہوا تو خلاف معمول لیلیٰ بڑی پرسکون سی پیا نو کے قریب بیٹھی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیا نو کی کلوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا ”تمہیں پیا نو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی، ”میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سُن لی تھی۔ تم چاہو تو اسی پیا نو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں نا لے“ میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کریم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خودی میری آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔ ”ہاں مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منسلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر: ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کی آواز سُن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہو گیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ لگتا ہے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری چھپائے نہیں کھتی۔ میں نے بڑ بڑا کر بہروز کو سلام کیا۔ ”مالک آپ وہاں آ گئے.....؟“ بہروز مسکرایا ”تو کیا کچھ غلط کیا واپس آ کر۔“ مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے؟“ میں نے نظریں اٹھانے کے لیے صرف اتنا بتایا کہ مالک کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی، لہذا ہم شینگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سُلانے اور سُن کرنے کے لیے بازار میں ہزار ادویہ مل جاتی ہیں، مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کر پائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سُلادے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لیلیٰ نے باہر نکلتا کم کر دیا۔ اب وہ تین چار دن بعد گھٹنے دو گھٹنے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھری میں رہتی۔ ان دنوں میں مجھے مارتھا سے پیا نو کیسے کا بھرپور وقت ملا اور مینے بھر میں، انگلیاں پیا نو پر خوب چلنے لگیں۔ خود مارتھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تنہا بیٹھا پیا نو پر کسی نئی دھن کی شق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر مگن ہو گیا کہ مجھے انیسویں صدی کے دروازے سے اندر ہال تک آتی قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی اور چونکا اُس وقت، جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔ ”اچھا بجالیے ہو.....“ میں گھر کر چوک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”معاف کیجئے“ مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔“ بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”انسان کو اپنے اندر اتنا لگن نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔“ میر نے دوبارہ معذرت کی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیا نو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔ ”مجھے صابن بتایا تھا کہ اس نے انیسویں میں پیا نو رکھوایا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالک کا اعتبار جیت لیا، حالانکہ لیلیٰ صابھی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے..... ایسا کیا جاوے ہے تمہارے پاس پری زاد، ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟“ میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر حسب معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں پُپ رہا۔ بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔

اگلے ہفتے کی ابتدا اسی سے محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد لیلیٰ صبا کی سال گرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے انتہائی دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لیلیٰ بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لیلیٰ کے اس کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری اُداسی چھٹی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نامعلوم سی اُداسی لے کر وارد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات توازن کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے، زندگی کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہروز سال گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتا بہروز کے قریب آیا اور تھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کہی۔ ”لیلیٰ بھی اُسی وقت وہاں پہنچی تھی، اس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور کشمکش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔“ تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز، یوں وقت بے وقت انہیں پریشان مت کیا کرو۔“ فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ایک آدھ دن آگے نہیں ہو سکتا یہ سودا.....؟“ ”نہیں مالک! وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا لمبا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔ ان کا زیادہ دیر جزیروں پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی ”مگر فیروز خان! تم جانتے ہو کل تمہاری مالک کی سال گرہ ہے، اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔“ لیلیٰ نے چلا کر پوچھا۔ ”کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے.....؟“ بہروز نے ہنسنے سے لہجے میں لیلیٰ کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سودے کے لیے اسے دو راتوں کے لیے ایک قریبی جزیروں پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تھا، مگر فیروز نے ابھی آکے بتایا کہ انہیں آج شام ہی لکنا ہوگا۔ لیلیٰ یہ سنتے ہی غصے سے کھڑی ہو گئی۔ ”نیک ہے آغا! تو پھر آپ جانیں اپنے ضروری سودے کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منائی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔“ لیلیٰ ہیر بختے ہوئے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لیلیٰ کے جانے کے بعد بہروز نے غصے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔ ”کردیا ناں اسے ناراض، فیروز خان۔ تم کبھی موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔ میں اسے سنا کر آتا ہوں۔“ بہروز بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لیلیٰ صبا بھی اسے پورے تک چھوڑنے کے لیے آئی، البتہ اس کے چہرے پر غصے کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بھی کبھی کبھی اُداسی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیلیٰ بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نبھانے کی زنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیے وعدے تو نبھا بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیے وعدے سے سدا وفا ہونے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتا دوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کی دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع لیلیٰ نے سر شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سیٹلی رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دبے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ مالک نے مجھ سے ہوائے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیوں کہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جا رہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیلیٰ نے میری بات سن کر ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر واپس آ جاؤں گی۔ میری دوست نے میری سال گرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔“ لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیے وعدے کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے، وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کھڑا کر دیا گیا۔

شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ لائٹ میں گلی جتیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکارف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ ”آپ نے بہت دیر کر دی۔ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق محفوظ کی گاڑی کو ابھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔“ لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”ہاں! بس دیر ہو گئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے، لہذا بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اُسی وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرفضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے جان آغا! دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آ پہنچے ہیں۔“ میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دو راندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان اتر کر ہماری جانب بڑھتے دکھائی دیے۔ پس منظر میں محفوظ کی وہ جیب بھی نظر آئی، جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چمکے دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کاٹنے جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لیلیٰ کا ٹھک ہوا چہرہ بلند کیا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جان آغا! میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سیٹلی بنائی ہے تم نے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملو!۔“ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ کرہے پائیں۔“ لیلیٰ نے جلدی سے تھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے ”معاف کر دیں مجھے آغا! بڑی بھول ہو گئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔“ بہروز کا چہرہ اب بھی ساٹ تھا۔ ”میں تمہیں تو معاف کر دوں گا جان آغا! مگر اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں بہکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ، کون ہے وہ بد نصیب.....“ لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا ”کہاناں آغا، بڑی غلطی ہو گئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ٹاپ فلور پر ایک بہت اچھا ریسٹوران ہے۔ سوچا، کافی پی کر دل بہلا لوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔“ بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا ”کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا.....؟“ لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھا دی۔ ”یہ پُر زاد..... یہی مجھے اس طرح کی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے، مجھے اسے اپنی مرضی سے جیننا چاہیے۔ میں کوئی بجنرے میں قید، قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر چوں۔“ لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر اڑام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر ہی میں اپنے حواس کو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے نظریں اور مجھے لگا، میرے سامنے لیلیٰ نہیں ناہید کھڑی ہے اور دم دہن میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ صبا کی بات سنی اور میری طرف پلٹا ”اچھا..... تو یہ ہے وہ نمک حرام..... اس سے مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مگر جان آغا، تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔“ ”مجھے ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ لیلیٰ روتے ہوئے گڑ گرائی ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، اس پُر زاد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے بھٹکا دیا۔ میری ہم ردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے بے انتہائی تہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا۔ تب ہی مجھے یوں اکیلے گھر سے نکلنے پر اکسایا رہا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔“ میں حیرت سے گنگ اور اپنی جگہ جما کھڑا لی کی یہ ساری خرافات سُنتا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ ”تم بتاؤ پُر زاد..... کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔“ میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لائق کی کھڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلا یا۔ ”جواب دو!۔“ ”کیا یہ سچ ہے.....؟“ میں نے سر جھکا لیا ”جی ہاں، مگر جو کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر لے کر آیا تھا۔“ ”ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو نامل کر لیا۔ بہروز کریم نے سرسراہتی آواز میں مجھ سے پوچھا ”کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ تمہاری گتھی کی چند سانس باقی رہ گئی ہیں۔“ میں نے بہروز کی طرف دیکھا ”جی مالک..... بس ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کر دیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تیسے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔“ بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصے سے زیادہ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ ”جانتے ہو، مرد کی بادی

کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، ٹھیک اُس لمحے، جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر بردہ کر لیا، پُر ی زاد..... بُرا کیا، بہت بُرا کیا تم نے۔“ بہروز پلٹا اور زور سے چلا یا۔ ”اے لے آؤ فیروز خان.....“ بہروز کی آواز اس ویران تہ خانے کی پارکنگ میں گونج کر رہ گئی۔ اُس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لیلیٰ خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی، کیوں کہ یہ پارکنگ تقریباً سڑک پر ہو چکی تھی اور پارکنگ والے اب چھت پر بنی نئی پارکنگ استعمال کرتے تھے۔ لہذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے لیلیٰ کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی، تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مگر آج وہی ویرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں ہمارے لیے وبال جان بن گئی تھی۔ بہروز کے چلانے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو محافظوں کی مدد سے ایک خوب صورت اور پینڈسٹم سے نوجوان کوختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر ٹیپ لپیٹے ایک جانب سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا، کیوں کہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر لیلیٰ کے جسم سے تو جیسے خون کا آخری قطرہ بھی خُز گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں زور سے چلائی ”نہیں آغا نہیں..... اس میں ولید کا کوئی قصور نہیں..... بخش دیں اے۔“ لیلیٰ دوڑتی ہوئی آئی اور بہروز کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بہروز نے کسی اُن دیکھی اذیت کے احساس سے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور دیرے سے یوں بڑبڑایا، جیسے خود کھای کر رہا ہو۔ ”کیوں جان آغا..... کیوں..... کس چیز کی تمھی جہنیں..... کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، عیش، آرام، دولت، جائیداد، رتبہ، عزت..... آخر کس چیز کی تمھی میرے پاس تمہیں؟“ لیلیٰ زار و قطار رو رہی تھی اور وہ اجنبی نوجوان بہروز کے محافظوں کے ٹکٹے میں ترپ رہا تھا۔ بہروز نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”یہ وہی ہے ناں، تمہارا سا بیٹہ، مگسٹر، استنبول والا، ولید.....“ لیلیٰ ترپ کر آگے بڑھی۔ ”ہاں آغا! یہ وہی ہے، اے میری محبت یہاں کھینچ لائی..... یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ پُر میں اپنی پہلی محبت کبھی بھلا نہیں پائی۔ معاف کر دیں ہم دونوں کو۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ کم از کم اے جانے دیں۔“ بہروز نے کرب سے اپنی منھیاں کھینچ لیں۔ رقیب کو سامنے زندہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک، اپنے محبوب کی زبان سے اس کی تعریف سنا ہوتا ہے۔ بہروز نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ ”واہ رے عورت! واہ، ساری کائنات کے سر بستہ راز ایک جانب اور تیرے من کا گورکھ دھندا ایک طرف۔“ تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔“ بہروز ایک جھٹکے سے فیروز کی طرف مڑا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز خان! ہمارے پیچھے کچھ چکر چل رہا ہے۔ اب دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے؟“ فیروز خان نے سر اٹھا لیا۔ اب مجھے بہروز کی منصوبہ بندی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے لیلیٰ کی نگرانی پر رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لیلیٰ صبا میری نگرانی میں غیر محتاط ہو جائے گی۔ اس کی سال گرہ والے دن جزیروں پر جانے کا پروگرام بھی ساری ذرا سے بازی تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے لیلیٰ کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس لیلیٰ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سب مہرے بہروز نے بہت ناپ تول کر پختے تھے۔ ساری بساط ہی بہروز کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور اب بازی بھی اسی کے ہاتھ تھی۔ بہروز نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف

دیکھا۔ ”مجھے لیلیٰ صبا بہت پیاری ہے فیروز..... بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے میں نے اس سے..... دھیان رہے، اے مرتے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو اور ولید چوں کہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہروز کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام لڑکے لڑکھن عاشقوں کی طرح مارا گیا، تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ لے جاؤ ان دونوں کو۔“ لیلیٰ زور سے چلائی۔ ”نہیں آغا! نہیں.....“ فیروز نے محافظوں کو اشارہ کیا، انہوں نے لڑکے اور لیلیٰ کو لے جانے کے لیے کھینچا۔ بہروز دھیرے سے بڑبڑایا۔ ”عشق بڑا ظالم ہوتا ہے..... جان کا صدقہ لیے بنا کہاں ملتا ہے۔“ اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہروز کی طرف بڑھا۔ ”انہیں معاف کر دیں مالک! ان کا قصور بہت بڑا ہے، مگر آپ رحم کریں۔“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خود کار مشین گن کا دستہ پوری قوت کے ساتھ نکل آیا اور میرا ذہن اندھروں میں ڈوب گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے تہ خانے کے کسی کونے سے دو فائرنگی آواز سنی۔ اور ان سے زیادہ بلند لیلیٰ کی کرب ناک چیخ تھی، پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنس دان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب انسانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) ختم جائے تو اسے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور روح نکل جانے کے بعد انسانی جسم کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں۔ جانے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا، مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ ضرور بہروز نے ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور اب میں کمرے میں نہیں، کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہروز نے۔ زندگی کے کسی امتحان میں بھی تو پورا نہیں اُتر پایا تھا میں..... چلو، جو ہوا، اچھا ہوا۔ قصہ تمام ہوئے شجر تو تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے..... خود اپنے سائے میں چل کر سفر تمام کیا۔ مگر میرا سفر ابھی کچھ باقی تھا شاید..... اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی اور کسی نے دھیرے سے میرا منہ پکارا۔ ”پُر ی زاد..... بوش میں آؤ، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منکب کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangugroup.com.pk

رومی کہتا ہے کہ ”تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکتا نہیں..... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے، جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔“ میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا، اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا، مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”پری زاد، ہوش میں آؤ..... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں.....“ میری چند ہیائی آنکھوں نے فیروز خان کا ڈھنڈلا سا بیولا دیکھا، جو مجھ پر ٹھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، چند لمحوں کی غفودگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انگلی میں اپنے کمرے کے بستر پر تھا۔ فیروز نے میرا چہرہ تھپتھپایا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دو پہر کی تیز دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سُدھ پڑا رہا تھا۔ میرے سر میں ابھی تک درد سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو بچی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چٹکر آیا اور میں نے جلدی سے پٹنگ کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سرخ اور سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روگائی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں ٹیکسوں کے پناہ گزین ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا ساحر، جادوگر ہے، لوگوں کو تو اپنا عادی بناتا ہی ہے۔ گھر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھے ہی فیروز نے گاڑی آگے بڑھا دی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

”مالک کہاں ہیں.....؟“ فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔ ”وہ وہیں گھر پر رہیں گے تین دن۔ مالک کے سوئم کے بعد ہم بھی واپس چلے جائیں گے گھر.....“ میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھٹکا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس، جو میرے سینے میں کسی پچاس کی طرح ابکی ہوئی تھی، فیروز نے ایک جھٹکے ہی میں اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ کچھ تیر، جن کے دھومو ہے سرے آگے کی جانب سے باہر کھڑے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنی اذیت ان کو جسم سے باہر کھینچ نکالنے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور امیدیں اکثر دغا دے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو ترقی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ڈرائیور نے رپورٹ درج کروائی کہ جیسے ہی اس کی مالکن لفٹ سے باہر نکلی، ایک نوجوان نے اس پر حملہ کر دیا اور نوجوان کے پستول سے لنگی گولی مالکن کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ ڈرائیور کی جوابی گولی سے نوجوان بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی، جس پستول سے لنگی تھی، وہ پناہ لائسنس تھا اور نوجوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا پستول لائسنس والا تھا، جو اس نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھا۔ میں جمع کر دیا۔ اور اس وقت ڈرائیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کر دیا تھا، تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آ سکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی تھی کہ آخر مرنے والے اس نوجوان کا مقصد کیا تھا۔ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے لائق اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا۔ یہ محبت تو انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنا دیتی ہے، آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو۔ حسن، صورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت..... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوا مانگتی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند، بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک ہفتے تک کسی اور کوشش میں منتقل بلکہ مقید رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے، مگر جیسے جیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزر رہی گیا۔

آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں تھے، مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا، جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا، وہ چپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا ڈور خلا میں گھور رہا تھا۔ ”آگے تم لوگ..... اچھا کیا، مگر اب کچھ دن تک ذرا محتاط رہنا، معاملہ تازہ ہے.....“ فیروز سر ہلا کر باقی ساتویں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تنہائی پاتے ہی ان سے براہ راست پوچھ لیا۔ ”آپ نے انہیں مار کیوں دیا، آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے، پھر.....؟“ بہروز اب بھی گم سم تھا ”محبت کرتا تھا، تب ہی تو مار ڈالا.....“ میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہو گئی۔ ”مگر کیوں؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے۔ جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی۔ آپ کے ساتھ نہ سبھی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں۔“ بہروز نے میری طرف دیکھا۔ میری نظر ٹھک گئی۔ ”اتنا طرف نہیں تھا مجھ میں پری زاد..... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خود غرض، بڑا کم ظرف بنا دیتی ہے۔ یہ جو لوگ محبت میں قربانی، ایثار اور بائٹ دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں، یہ سب بکواس ہے، جھوٹ بولتے ہیں سب۔ محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خود غرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خود غرضی اور سب کچھ پالینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھ لو، ان کی محبت میں ہی بڑا کھوٹ ہے۔“ بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں کھل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اسے دل کی بات سُنانے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کر پاتے، کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز نوٹ

نوٹ کر نکل رہی تھی۔ ”تو پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ نے۔ میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مار ڈالتے۔“ بہروز اب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ”ہاں، تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت۔ بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا۔ کیوں خود سے اتنی نفرت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوہڑا دل کلاس طبقے کی محرمیاں ہیں۔ مرد دولت، اختیار، طاقت اور تہ سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فلمی ستاروں کی ضرورت ہے۔ سپنوں کے شہزادے صرف ناؤز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پری زاد۔“ میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لپٹی کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی بہروز کو کچھ یاد آگیا۔ ”ہاں، مگر تمہیں خود گولشی کا اتنا شوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے ذریعے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آئی قضاء تمہارے حصے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ بولا، کیوں.....؟“ اس لیے کہ میں آپ کے نوکروں اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت کو سورا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لپٹی لگن نے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی پہلی یارشتے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تنہائی سے گھبرا کر۔ ورنہ میں کبھی آپ سے نہ ٹھہرتا۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں جانتا ہوں، اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہر حال، تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمہ داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملنے جانا اور ہاں اب تم انکیسی ہی میں رہو گے۔“ بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انکیسی میں واپس آگیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آرامستہ دفتر میں پہنچا دیا۔ ”یہ آج سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھا عملہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔“ میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا ”تم بہت جذباتی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہوگا، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا بکھیرا نہ کھڑا کر دے، لہذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ویسے بھی دعویٰ کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یکساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔“ فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا پری زاد آج دعویٰ کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا منیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین چار مرتبہ اسے گھما کر بارہویں منزل پر واقع اپنے دفتری بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے دعویٰ شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اُس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانا راز بھی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے، حقیر اور کڑے کوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی بتاتا ہے کسی کام سے دعویٰ آگیا، اور عملے سے پوچھتے پوچھتے فیکٹری کے دفتر تک آپہنچا۔ مجھے منیجر کی کرسی پر بیٹھ دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چڑا سی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔ ”اب کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی گم مسم بیٹھے رہو گے؟“ رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے انڈیل لیا۔ ”پری زاد پیارے..... سچ بتاؤ، تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتا نہیں سکتے۔“ میں نے گہری سانس بھری ”نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ پوچھنا ہی ضرورت پیش آئے۔“ مگر میرے جواب سے رفیق کی تضحیٰ نہیں ہوئی۔ ”دیکھو پری زاد! میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو ایسی گہرہ میں الجھا بیٹھے ہو، تو ابھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دعویٰ سے پار کروا سکتا ہوں، ایک دودوست ہیں میرے لانچ والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہوگی۔“ میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ ”مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ بولو، خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو.....؟ ہے کوئی ایسی لانچ، بحری جہاز یا اڑن کھٹولا، جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کروانے میں مدد کر سکے.....؟“ رفیق کی پلکیں نم ہو گئیں اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔

میرے دن اور رات پھر سے اسی یکسانیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بے زار رہتا تھا، البتہ پیانو سے دوستی پکٹی ہو چکی تھی۔ لپٹی کی موت کے بعد مار تھانے محل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی ڈھنسیں بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھری پر رہتا تھا، خاموش، کھو یا کھویا، افسردہ سا..... اُس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا، تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ ”آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟“ ”ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔“ بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی، تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدر انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا صرف یادیں بھلانے کا اختیار نہ دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں پٹا سکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد واپس آگیا۔ مگر اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا، جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس خوک نوجوان، ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دعویٰ پہنچ کر لپٹی صبا اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کروانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہروز کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہروز نے ہم سب کو محل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پُرسکون لہجے میں بتایا کہ دعویٰ پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہو چکی تھی، اسے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے، لہذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد گھنٹی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں لٹھنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دعویٰ پولیس بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو، تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی اکھاڑنا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں بکے، باقی تمام ممبرز نے حسب توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سنا دیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے ارد گرد بہت بچن کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جانے ہی دروازہ بند کیا اور پریشانی سے بولا ”ہم سب یہیں رہیں گے، مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا دیتا ہوں۔ سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں، دور اتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔“

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سنی۔ ”کبھی کبھی روپوشی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے فیروز خان..... تمہاری زاد کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ اُس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھریا جائے۔“ بہروز کریم کا لہجہ جتنی تھا۔ فیروز ماپوس سا وہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی وہاں کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔ ”جب گلوچ کا وقت آئے تو خدمت کرنا، چلے جانا۔“ میں نے پلٹ کر جواب دیا ”آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں۔“ بہروز نے رگڑا کر ایک لمبا سانس لیا اور ایک ٹیک میری جانب بڑھایا۔ ”اسے رکھو، بُرے وقت میں کام آئے گا، اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو، یہ دنیا مرنے سے ہوئے کو مزید مارتی ہے، مگر جو یہ نہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے لٹکا کرے، اُسی کو سلام کرتی ہے، دنیا کو لٹکا کر اس کے لوہے زاد..... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بھلائے کو یہ ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود اسے اپنے ہاتھوں سے کھود دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش، تمہاری طرح میں بھی عمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“ میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ”کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔“

لیلیٰ صبا کے قتل کی نقیشت کا دائرہ حیرتی سے ہمارے گردنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دینی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے ارد گرد راستوں کی گمرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حتمی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی لالچوں میں بٹکا کی سی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر کچھ فیصلہ پڑھ کر بہروز سمجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی گھنٹی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سالگرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ذمہ سونپ دیا اور شہر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی، فیروز خان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا، جب تک میں اور دیگر ملے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام ہی سے محل میں ہل چلی سی بچ گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک ہمیشہ کی آزمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔ فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، یہ جواب بھی کھیل لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔“

بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ڈرائیور کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا اور گھر سے نکلے ہوئے لاؤنج میں پڑے بہروز کے رگڑا کر سانس سے ایک رگڑا اٹھالیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی، تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں رگڑا لیے پچھل سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا کہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام جڑ دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ، ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیاء، اوقات کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی چروکی جیپ ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دہلی کی سڑکوں پر ادھر سے ادھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیپ کو ہم نے برابر یہی تاثر دینے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان چھڑانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں، میں نے ایسے مناظر بار بار دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں کبھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے، جہاں تک اس جہان ناقام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہیں، جو کبھی اُن کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیل کیا بلا ہے، جو انہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا چچا کرنے والی جیپ میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی جھپٹنے سے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بے مشکل ان سے معذرت کی کہ مالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشاءِ تہنہ تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہر حال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سینے رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نہ سنا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دل چسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے جھوم میں تنہا کھڑا محفل برخواست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ پھر چائیک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور سا اٹھا۔ چند لمبے بعد دہلی پولیس کا ایک بڑا افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ حکمانہ تھا۔

”تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے.....؟“ ”بس آتے ہی ہوں گے مالک۔“ افسر مخصوص عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔ ”ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا ”جب وہ وہاں آئیں تو گرفتار کر لیجئے گا۔“ مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دیر سے دھیرے چھٹنے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا تحت باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی ہنسنی سن گئیں اور وہ غصے میں میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔“

(جاری ہے)

بائیں شہنشاہِ نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسم“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغہٴ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازنی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوتا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguogroup.com.pk

میرادل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا ”میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔“ کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے لاک اپ پہنچایا گیا، تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حوالات نما کمروں میں بند پایا۔ بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا، اور میں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اُسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار اُس کے ہاتھ رہتا ہے، جب فیصلوں کے مختار دوسرے ہو جائیں تو پھر اک اُن جانا سا سکون اور ٹھہراؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی سمیٹ لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھا، پھر مجھے بھلا کا ہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سکون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”کوہڑی زاد! نیند کیسی رہی؟“ کہتے ہیں مشکلات سے دُور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، وگرنہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلاء نے ایڈی چوٹی کا زور لگایا، مگر اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سنا نا چھا گیا، تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی ”آپ سوتو نہیں گئے مالک.....؟“ کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی ”کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے؟“ میں نے ایک گہری سانس لی ”معذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالگن کے قتل کا اعتراف کر کے جرم اپنے سر لے لوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو مہربانی ہوگی۔“ بہروز نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری ”بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لاتا ہے، جتنا وہ ڈھونڈ سکے۔ تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے پُری زاد، اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلیٰ سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد جی کی تہد تک پہنچ کر اُسے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا۔ میں نے زندگی میں بہت جرم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رشتی کوٹنگ ہونا تھا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ، مجھے ابھی بہت جاگنا ہے۔“ پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی اپنی آہنی کوٹھریوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ بہ ظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے، لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھری گتیں سمیٹ کر اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو، جب کہ دوسرا وہ بد نصیب تھا، جس کی زندگی ہی عُمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچی ہستی میں جنم لینے والے دو بچوں میں کیسے توازن رکھتی ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب برابر کیسے تولے جا سکتے ہیں، چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی توجہ اہوگی۔ کوئی تو صلہ یا انعام ملے کر رکھا ہو گا اور پوالے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا یا پھر اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جن کا اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، لہذا انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب گم صم کھڑے بہروز کریم کا بیان سنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکزی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہم سب کی ٹیلیکس غصہ میں تھی، بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں، زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کو جی بھر کے جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس قماشے سے ادب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک پل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں، تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں نا پتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں عُمر بھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سنائی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی۔ چند کو عمر قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ دوسرے نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کر دیے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جو فوری ہو، ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف سزا بن جاتا ہے۔ بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، چاند اور اثاثوں کو دھتھو میں تقسیم کر کے ادھا حصہ اپنی بیوی اور بچوں میں بانٹ دیا اور ادھا اپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلائی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے ایک جا کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر اہتمام کر دیے، جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت جی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایانِ شان تھا۔ شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی

شدید خواہش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، مگر سزاوار جزا کا یہ نظام خود بخود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ میں بہروز کریم کے اٹانوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیا نو میرے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں تحریر تھا کہ چون کہ اس پیا نو کا وزن بہت زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیا نو محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل و ہیئت کھو نہ دے، لہذا وہ جاننا د، جہاں وہ پیا نو پڑا ہوا ہے، تمام تر محل اور انگیسی سمیت پڑی زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات نسلوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چڑا سی تک کو برابر بانٹا تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کا کرن اس سے آخری باہل کرواپس لوٹ رہے تھے، تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے، تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے نہیں ملو گے پڑی زاد.....“ مجھ سے رہائیں گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود کو مصائب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نم آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ”کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا، آپ کے دکھ اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از کم غرقید میں تبدیل کروا دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے، قاضی نے تو بس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔“ بہروز نے سراٹھایا ”شاید میں پہلی کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا پڑی زاد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیمک کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے تجویز نہیں کی کہ میں نے اُسے مار کیوں ڈالا بلکہ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری واپسی ناممکن ہے۔ مگر یہ راز تب گھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ جب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے پناہ میں نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔“ اس نے مجھے آخری مرتبہ سمجھنے کے گلے لگایا ”اپنا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہوتی، مگر نہ جانے کیوں، خود کو اتنا ازاراں کر رکھا ہے۔“ میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر سپاہی میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھری کے پاس رک گیا، وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آگیا۔ میں

نے نم پٹکوں سے اس کا استقبال کیا ”جار ہے، ہو فیروز؟“ وہ ڈھک سے مسکرایا ”ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے، میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے اُن سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ورنہ میں اوپر جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا.....؟“ میں نے فیروز کا کندھا تھپتھپایا ”تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا بھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جنہیں تم یہاں تنہا کسی آسے کے بغیر چھوڑے جا رہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست؟“ فیروز مسکرایا ”پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان، ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلالینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ پڑی زاد، مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری عہدہ ہی وہاں کام آجائے، ورنہ غم تو بس ریاگیاں گئی۔“ میں آنکھوں میں آنسو لیے بو جھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

بہروز اور اس کے وفادار فیروزی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفن دیا گیا، جہاں انہوں نے عروج کی آخری منزل سر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ زوال پزیر ہو گئے، بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوت گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھنٹوں بڑے ہال میں گم غم بیٹھا اس بڑے پیا نو کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی پہلی سبائینہ کھربجایا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیا نو کے سروں پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشان منادوں۔ پھر ایک شام مار تھا واپس آگئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے پُڑے سے لیے انگینڈ گئی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے مار تھا کو پھر سے کام پر رکھ لیا اور اس سے انگیسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور پہلی سبائینہ کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ دعویٰ واپس بلوایا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کر لی ”نہیں پیارے! یہاں پر ٹو ہی جتا ہے، مالک یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔“ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ ”ٹھیک ہے، مگر ایک شرط تمہیں میری بھی ماننی ہوگی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا۔“ ”کیسی شرط.....؟“ میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ”تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریٹائرمنٹ کھونا چاہتے تھے ناں، یہ تمہارے ریٹائرمنٹ کی چابی ہے۔“ رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگ لیا ”تُو صرف نام ہی کا نہیں، دل کا بھی پڑی زاد ہے.....“ بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دولت ایک ایسا مقناطیس ہے، جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصے آئے تھے، وہ وہی کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مقناطیس تھے، میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے منجوز کی بتائی ہوئی اسکیمز میں پیسے لگاؤں اور پھر مقناطیس پینٹ کران سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استادستانہ کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امور کو پینٹ کرانوں دولت گنتا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیکن میں اس معجے تفریق کے کھیل سے چند مہینوں ہی میں اکتانے لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ نا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سرد رہنے لگتی ہے۔ میرے منجوز مجھے روزانہ پچاس لاکھ کے منے گرہتا ہے اور پھر جب ان کے منصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے اب بہت اکتاہٹ سے سنبھالتا تھا۔ اُن ہی دنوں اسپین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا مینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کتر اتا تھا اور حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں جاننا نہ پڑے، مگر اس بار کچھ ایسی صورت حال بنی کہ مجھے ہارسلونا جانا ہی پڑا۔ یہ پیسا بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو پہل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری فلائٹ کا ٹکٹ عملے نے برنس ایگزیکٹو کلاس میں سب سے اونچی تقسیم کا ٹکٹ کروا دیا تھا، لہذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سامرا عملہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روٹ پر چلنے والی لوکل بس یاد آگئی، جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک اُن گنت سفر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر س کھا کر چند سکوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکنے ہی کی اجازت دیتا تھا۔

اہلین کے جس سات ستارہ ہوئل میں میرا قیام تھا، اس کے صدقاتی سوٹ سے باہر دیکھنے پر دور سفید پتھر اور لکڑی سے بنایا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے میزبانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہو جانے کی خوشی میں مجھے اُسی اکھاڑے میں بھینے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر ڈالا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر میزبان بے ہمتی سے کہنے لگے کہ کوئی اہلین آئے اور یہ تماشا نہ دیکھے، تو اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے کبھی بڑے شہر اب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ، نفسانسی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا، مگر یہ شہر یا بڑے شہروں سے کچھ جُدا دکھائی دے رہا تھا؛ مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آندہ بحیرہ ریں سے کرائے پر لی گئی الف لیلٰی کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں، وہی ستونوں کی قوسِ قزح، اندرونِ شہر اینٹوں کی کئی گلیاں اور رستے، نئی تعمیر کا شاہ کار، الف لیلوی گھر اور عمارتیں..... مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کچھا کچھ تماشا نیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور سے یہ وحشت بھرے تماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ مائل فاننگ کے سوٹ پر سُرخ جبکٹ اور سُر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سُرخ چادر لہراتا، ہسپانوی مِل فائزر اکھاڑے میں داخل ہوا، تو تماشا نیوں نے تالیوں اور سیٹوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کنواری لڑکیوں نے اس وجہ ہلڑے کے پھولوں کی بارش کر دی۔ مگر مِل فائزر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے یہ ساری روداد کسی رواں تبصرے کی طرح سن رہا تھا۔ یہ لڑکا اکاہلین کے بہترین مِل فائزر میں سے ایک تھا، جسے لوگ انتونیو کے نام سے جانتے تھے۔ انتونیو آج تک اہلین کے ننانوے جنگی ہمیشوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ ایک سوواں مقابلہ تھا۔ اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سیکڑا مکمل کر کے ماریا سے شادی کر لے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں بتل دھرنے کی بھی کاتام ”بکر“ رکھ چھوڑا تھا، اور بکر نے اپنے نپاؤے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی مِل فائزر کا جسم ادا جیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا۔ مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مد مقابل آرہے تھے۔ انتونیو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو مٹھو کر دیکھا، اور کمرے میں بند بکر نے اپنے گھر سے روایتی زمین کو کھڑچا، ماریا نے انتونیو سے وعدہ لیا تھا کہ اس آخری بھینے کو زبردستی کرنے کے بعد وہ اس کیل کو ہمیشہ کے لیے خبر باد کہہ دے گا، کیوں کہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نو کیلے سینگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انتونیو نے اپنی سیاہ مٹلی پوشاک کے سنہری مٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لیے مخصوص چمڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی لوک زمین پر ٹیک کر ایک شان بے نیازی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشا نیوں کی تالیوں، سیٹوں اور شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر نئے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سر کا کر انتونیو کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا دوسرا سُرخ گلاب بھی اُس پر نچھاور کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ بلایا اور تعظیم سے سر جھکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انتونیو اور بکر کے مقابلے پر تھی۔ بکر کی آنکھوں سے دھنکی بنا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سوویں شکار انتونیو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑا سُرخ کپڑا لہراتے دیکھ رہا تھا، مگر اتنی جنگوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سُرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر نڈھال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دو آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری طرح گھونپ کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، مگر اسے یہ لحد آنے سے پہلے ہی اپنے دشمن کو اپنے نو کیلے سینگوں میں پرو کر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادا جیڑ کر رکھ دینا ہوگا۔ مِل فاننگ دراصل بھینے اور لڑاکے (مِل فائزر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے، وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انتونیو نے سُرخ مٹلی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہو گئی۔ بکر کا پہلا وار خالی گیا اور انتونیو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر بکر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں دافوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ بکر غضب ناک ہو کر پلٹا اور دُور سے بھاگتے ہوئے قریب آ کر اچانک اپنا زانو یہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینگ کی نوک نے انتونیو کے پہلو میں چنگاریاں سی بکھریں۔ تماشا نیوں کی چیخیں نکل گئیں اور مار یا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ انتونیو اور بکر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام حریف سے نہیں۔ انتونیو کے ہاتھ میں پکڑی سُرخ چادر اب دھیرے دھیرے جھیتھروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں بکر کا جسم انتونیو کی تلوار کے چرکوں سے لپو لپو ہوا تھا، وہی انتونیو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خون خوار قاتل بھینے کے جسم سے سُس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخ بلند ہو جاتی۔ اس نے چلا کر انتونیو سے کہا ”انتونیو! بس کر دو، میرے فائزر، یہ دیوانگی ہے۔ مقابلہ ختم کر دو۔“ مگر انتونیو نے مُسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھینے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے، مگر اس نے خود کو بھی بکر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تاکہ بھینسا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انتونیو موقع ملنے ہی اسے ختم کر دے، تماشا نیوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہو رہی تھیں اور وہ سب انتونیو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انتونیو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ بکر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو لے رہے اور پھر بکر غرغراتا اور منہ سے جھاگ بھاتا انتونیو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انتونیو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دستہ مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھنے دائیں ہاتھ میں تمام لیا۔ بکر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکا دی، تاکہ اپنے سر کی جانب لپکتی تلوار کی نوک سے بچ سکے، مگر تلوار دے تک اس کے سر میں اتر چکی تھی۔ خود انتونیو بھی بکر کے تنوں و زنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب وہ زمین کی طرف گر رہا تھا تو بکر کے نو کیلے سینگ اس کے گرتے جسم کا انتظار کر رہے تھے۔ انتونیو کے جسم میں بکر نے اپنے سینگ پرو دیئے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی رہتی زمین پر گرے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا ”بہت خوب..... تم واقعی بہترین لڑکا تھے میرے دشمن.....“ ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سندھ ہو گئی۔ سارے مجھے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کھرا اور انتونیو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشا ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اُسی لمحے کسی نے میرے کان دھسے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے تماشے میں اتنا جھکا کر بُری طرح چونک گیا، یہ وہی شخص تھا، جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ دُسر انداز میں مسکرایا ”بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار، آج پکڑے ہی گئے.....!!!“

(جاری ہے)



پاشم ندیم

پاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاڈ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گرو، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اُس شخص کی طرف دیکھا، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ وہ مسکرایا ”ہم دونوں نہیں، صرف تم جانتے ہو۔“ تم پر ہی زاد ہوتا، بہرہ ور کریم کے جاں فشین..... ”ضمیم، میں صرف پر دی زاد ہوں۔ بہرہ ور کا جاں فشین بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔“ اس نے ہاتھ اگے بڑھایا۔ ”لوگ مجھے سیٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شان، بمبئی میں رہتا ہوں۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بمبئی“ ہاں بمبئی، بمبئی، یہ نیا نام بمبئی ہمیں تو بالکل نہیں چتا، جو بات بمبئی میں تھی، وہ اس بمبئی میں کہاں۔ جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں، کتنی یادیں بجی ہوئی ہیں ان ناموں کے ساتھ، اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمکنو کہہ کر بلانا شروع کر دے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ سیٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آ چکا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوائی۔ میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آ کر لگ گئی۔ سیٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارا مالک بہرہ ور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے، باقی باتیں شام کو ہوں گی۔“ سیٹھ ابراہیم مجھے ایک نئی لکھن میں جتلا کر کے چلا گیا، شام کو سوئمنگ پول کے کنارے منجھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مددے کی بات کی۔ ”ہاں بولو سیٹھ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟“ سیٹھ دھیرے سے مسکرایا ”تم نے شاید غور سے میرا نام نہیں سنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دم سے چلتی ہے، میں زیادہ تر دہائی میں رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی میٹل مل گئے۔ شاید بہرہ ور نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کاروبار کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری ہی میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے۔ کہو، کیا کہتے ہو.....؟“ ”میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“ ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتار کر ”ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپا لگاتے ہیں، ایک فلم سٹر، اسی کروڑ تک چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے، پٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چٹ بھی ہماری اور پٹ بھی۔ منافع ہو تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہو تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں چُھپ جاتا ہے۔ بولو، پیسا لگاؤ کے فلم انڈسٹری میں؟“ ”تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنہٹا۔“ سیٹھ ابراہیم طہرے سے مسکرایا۔ ”جانتا ہوں، تم شاید پہلے بہرہ ور کے خاص محافظ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے۔ ہم ان کٹھ چلیوں کو اپنی انگلیوں پر نہاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ شاہ رخ، سلمان، کرینہ یا کترینہ کسی کے بیٹے، بھائی کی سالگرہ میں ایک کنوائے چلے آئیں۔ یا ہمارے خاندانوں کی کسی شادی میں اسٹیم ٹرین پیش کرنے کو دوڑے آئیں۔ یہ سب

ہماری زیر زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور جی پوچھو، تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔ اور چوں کہ بہرہ ور کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عہدے دار تھا۔ لہذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں۔ آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ویسے تم اتنا لالچ دینے کیوں رہتے ہو۔ دہائی میں بھی، میں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سنا ہے، پیٹے پلائے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم نے.....؟“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے، اور میں جی کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلی طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ابن غلام..... ابن غلام۔ اور اب مجھ میں کوئی ”خوئے سلطانی“ پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سر پر جیتی ہے۔“ سیٹھ ابراہیم میری بات سن کر سنجیدہ سا ہو گیا۔ ”سنے کڑوے جی اتنی آسانی سے کیسے بول لیتے ہو تم.....؟ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے بہرہ ور نے محل میں کسی

عورت کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا، اگر یہ سب تمہاری زندگی میں کوئی ممتی نہیں رکھتے، تو پھر اتنا پیسا بھی کس کام کا۔ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری.....؟“ میں چپ رہا، اب میں اسے کیا بتانا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر آرزو سے سوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پیار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ ہنا کسی حقیر، فطر، حقارت اور ترحم کے جذبات کے۔ سیٹھا ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رُکا۔ ”اچھے لگے، ہوتے مجھے، لالچ نہیں ہے تمہارے اندر اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پالے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، ہاں، تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی تھی مجھے۔ دینی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر، ان کی خاص توجہ ہے آج کل..... تم اسی لیے بچے ہوئے ہو، کیوں کہ فی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔“ سیٹھا ابراہیم واپس پلٹ گیا۔

میں دینی واپس پہنچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے سیٹھا ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دینی انٹرپورٹ ہی سے میری نگرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح و شام، آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہراس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھن چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے وہ شہر نہیں، کوئی قید خانہ ہو، شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہنا گھلے آسان تلے قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور سینٹ سے بنی عمارتوں کے صحرا سے اکتانے لگا تھا، لہذا میں نے اپنے ملک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ رفیق نے یہ خبر سنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا۔ ”خوش کر دیا تو نے یار..... پتا نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکاہٹ لگ رہی ہے۔ ٹو چل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا ضمیر یہاں کا نہیں ہے یار..... چاہے ساری عمر گزرا لیس، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس اُن جانے پن سے تو نجات ملے گی۔“ میں نے اپنے باقی اشفاد کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سنایا تو وہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبا لے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مہینے میں ایک دو بار چکر لگایا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہولتیں پیدا کر دی ہیں، ان نئی ایجادات نے۔ انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصور اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رابطے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے ہاتھ کو کیئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کر دیئے اور اس سے، دینی سے صرف بہروز کا سفید پیا نو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔

میرے عملے نے دو ہفتے کی جاں فشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کر دیا تھا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آگیا۔ میں نے رفیق کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو مٹی والا مکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روار رکھے، اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان گل دستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، سبھی بہن بھائی اور ان کی اولاد، بھابیوں اور بھائیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آگیا، جب میں یہاں سے دینی جانے کے لیے ایک پرانے رکشے میں انٹرپورٹ پہنچا تھا۔ اُس دن میرے گھر کے صحن تک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے پل میں بدل جاتے ہیں، یہ دنیا کے بدلنے رشتے..... ساری عمر جنہوں نے پُر ی زاد پر سنگ باری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پٹیاں نچھاور کر رہے تھے، جوتج یہ ہے کہ مجھے ان کے برسائے پتھروں نے اتنی چوٹ نہیں پہنچائی تھی، جتنا لہولہان مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بہن بھائیوں کو اتنا روپا بھجا تھا کہ وہ سب آج اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے گھروں میں خوش تھیں، سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر گزراؤں، بھائیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بن ٹھن کر آئی تھیں اور ہر بھابی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں انٹرپورٹ ہی پران میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں، حالاں کہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آرہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر رجز کر کے خود کو اس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد فوری نوعیت کی کاروباری میٹنگ کے لیے جانا ہے اور میں موقع ملتے ہی ان سب کی طرف فردا فردا حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے فیجرز نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ انٹرپورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرسدیز گاڑیوں کا فلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے اور گلیاں مجھے اسی طرح خود پر مسکراتے نظر آئے، جیسے میں انہیں سات سال پہلے مُکا کا چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے ہم پر دیس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہی راہیں جن پر میں جاتے کتنے سال تک جوتیاں چٹا تار ہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا، تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ درود دیوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سن نہیں پاتی۔ شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا۔ مگر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی۔ وہ شروع ہی میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے سے کچھ ہچکچا رہا تھا، مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سکریٹری انچارج بھی مقرر کر دیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی جیب سے ایک غیر ممنوع پتول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ ”یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس اسلئے کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کسی فکر کا ضرورت

(جاری ہے)



.....باشم ندیم.....

باشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا نثر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ہیرو ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

استاد مستانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اوزار بطور ہتھیار اٹھالیے، کیوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اُن کا استاد اکیلا ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تبھی میں نے پلٹ کر پچھلے ہوئے استاد مستانے کی طرف دیکھا۔ ”کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لینے استاد..... اب تو اس کے اردو گانے بھی چائیز میں سنائی دیتے ہیں۔“ استاد کا منہ گلے کا ٹکڑا رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہو گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہو گئی اور دوڑ دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ”او بے وفا.....! اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی۔ مجھے رفتی نے فون کر کے بتایا تھا کہ تم واپس آ چکے ہو۔“ سارا گیر راج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک ہنگامہ سا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لگایا، مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا، مگر آج اُن کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا۔ ہم کم زور اور بے بس انسان جنم سے لے کر فنا تک سبکی تو کرتے رہتے ہیں، اپنے خوابوں کا چچھا، ان خوابوں کو بچ کرنے کی دھن میں لگن..... مگر ہر ایک کے حصے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں اور گیر راج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ کبھی میرا خواب نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا سپنا بنا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میرا، مگر اس کی تعبیر کے لیے جانے مجھے ابھی کتنے طویل رستوں سے گزرنا پاقی تھا کہ منزل ابھی تک لاپتہ تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد مستانے نے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے میری پسندیدہ دودھ جتنی چائے منگوائی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹنگر ٹنگر مجھے دیکھنے لگا۔ ”تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے، ورنہ میرا تو کرامات سے یقین ہی اٹھ چلا تھا۔ جو تم نے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دنیا میں کہاں ہوتا ہے بھلا۔“ میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ”صرف تھوڑی سی دولت آ گئی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بدلا استاد..... میں ابھی تک وہی پڑی زاد ہوں۔“ استاد نے چیئر تبدیل کر کہا۔ ”کمال کرتے ہو تم، دولت سے بڑی تہلیل بھی کوئی اور ہوتی ہے کیا.....؟ لوگوں کی زندگیاں صرف ہو جاتی ہیں چند دھیلے کمانے میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھو، سدا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں، یا ابھی تک وہی شریعلے، کنوارے پڑی زاد ہو؟“ میں نے مزے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ”مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد، اور پھر شاگرد بیاہ کر لے اور اس کا استاد کنوارا رہے، یہ کہاں کا دستور ہے؟“ استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”کیوں اس غمر میں میری لٹیا ڈوبنے کی بات کرتے ہو پڑی زاد پیارے، اور یہ کیا بات کر دی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی، ذرا اعلان تو کر کے دیکھو نکاح کا، پورا سوئمبر رچے گاتھارا تو.....“ میں نے استاد کی بات دوسری جانب موڑ دی۔ ”میری شادی کی بات چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ گیر راج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کروایا۔ کام والی گاڑیاں بھی اکاڑا کھڑی نظر آ رہی ہیں، مچن میں۔ یہ سب کیا ہے.....؟“ استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندا چلتا ہی رہتا ہے، تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟“ اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سن کر راز کھول دی۔ ”پڑی زاد بھائی! گیر راج تو گرو پڑا ہے ہمارا تین سال سے۔ استاد غلط بتا رہا ہے، کوئی دھند نہیں، صرف مندا ہی مندا ہے آج کل یہاں۔“ استاد نے آنکھیں دکھاتے ہوئے اسے بُری طرح سے جھاڑ پٹائی۔ ”کم بخت! اٹو بائیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے، چل دفع ہو، جا کر اس اٹھتر بیاسی کروالا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری۔“ لڑکا منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں استاد! گیر راج گرو پڑا ہے، کیوں.....؟“ استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”اب کیا بتاؤں پڑی زاد! پرانے میکینک اور گیراجوں کا کام ٹھپ ہو چکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب سیل بند آتے ہیں۔ ٹیوننگ اور مرمت کمپیوٹر والی مشینوں پر ہوتی ہے۔ نائز ہائیڈ کے آگے ہیں اور خرداکام اب ماڈرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس تو وہی چند پرانی کھنار گاڑیاں آتی ہیں، جن کا مزاج یہ نئی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں۔ خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گیراج گرو ہی نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا نیلائی کے بعد نیا مالک کہیں ان سچوں کو بے روزگار نہ کر دے۔ تم تو جانتے ہو، ان سب کے گھر، ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہا کہ کم بختو، جاؤ جا کر کوئی نیا دھندا ڈھونڈو..... پر، یہ ہیں کہ یہاں سے ملتے ہی نہیں۔“ میں چپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سُنتا رہا۔ ”کس کے پاس گرو پڑا رکھا ہے یہ گیراج تم نے.....؟“ استاد نے بے جا چرگی سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ، بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے ٹنگ نہیں کرے گا۔“ مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔ ”استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں پیارے! استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ضرور لیتا کچھ نہیں۔“ میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمالی کو فون کر کے گیراج بھیجنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑبڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمالی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا، جس کا پتا گیراج کے کبھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد ہی کمالی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں نے جاندا کی آزادی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیے۔“ یہ گیراج جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے استاد۔ اگلے ہفتے تک نئی کمپیوٹرائزڈ مشین ہی آجائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی گمرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم ٹپ ٹاپ بنادو۔ اگلی دفع جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد مستانے چاہیے۔ ہاں، مگر یہ ریڈیو نہ بدلنا۔ اس کے پتا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا۔“ استاد مستانے گم سم سا ہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاندھا چھپھپھایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے مڑا۔ استاد نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ ”پڑی زاد.....“ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے، تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت، بے جان اور کھرے کا گند کے چند روپے اپنے اندر لٹکی خوشیوں پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرتے، کرشمے دکھاتا ہے یہ پیسا۔ روتوں کو ہنساتا ہے اور ہنستوں سے گھڑ کر انہیں آٹھ آٹھ آنسوؤں لاتا ہے، اور یہ دولت مند کتنے ان جان رہتے ہیں، اس پیسے کے استعمال سے۔ کاش! ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھائے کا سودا نہ ہوتا، مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے، بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ دنیا دل والوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

گیراج سے نکلنے نکلنے سے پہلے کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونیورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی کو ادھی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دفنایا ہوا، وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا ڈائیوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہی جاتے وقت میں اپنی ساری نظمیں اور کلام مٹن کے ایک کيسے میں بند کر کے اپنے پرانے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دینی لے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔ ”تم یہی زاد ہونا۔۔۔۔۔“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے تھے۔ مجھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے ٹنگلی ہانڈھے دیکھ رہے تھے۔ ”جی۔۔۔۔۔ میں یہی زاد ہوں۔۔۔۔۔ مگر آپ۔۔۔۔۔؟“ وہ میری طرف بڑھے۔ ”بھول گئے، یادداشت کی کم زوری تو بڑھا پے سے مشروط ہوتی ہے، مگر میں نے تو تمہیں پہلی نظری میں پہچان لیا تھا۔“ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ”مجھے پہچاننا تمہارے جانے کے بعد اردو بزم ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کہی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرپے میں چھتی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ”مگر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔۔۔۔۔“ ہر سال جب بھی اوتھیلو کھینچا جاتا ہے، پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور دہرائی جاتی ہے۔“ میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سنتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ انہیں بتا دوں کہ میں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کالج کی چند مہینوں میں اک ذرا سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور بس۔۔۔۔۔ انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، تم اچانک یونیورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، تعلیم مکمل کی یا نہیں؟“ میں نے دھڑے سے جواب دیا۔ ”کچھ مجبوریاں تھیں سر، مجھے دینی جانا پڑا۔“ سر احمد نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گاڑی کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے، تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں، لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔ شعبہ اردو میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے۔“ میں نے طریقے سے معذرت کی۔ ”نہیں سر۔۔۔۔۔ آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائیے گا۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونیورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ نٹ کھٹ سی لہجہ بھی یاد آئی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سینٹھ عابد سے شادی کے بعد کبھی اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا تھا۔ لہجہ کی ماں کے ایک جیسے میری زندگی کے تمام راستے بدل دیئے تھے، مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا لگن ہوا کہ اپنے اندر بسنے والے اس حساس اور نازک انسان کو بھی کچل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا، لیکن اس ساری تنگ دود سے مجھے کیا ملا۔ میں تو آج بھی اتنا ہی تنہا اور اکیلا تھا، نہ کسی کے حرفِ دعا میں تھا، نہ کسی کے دستِ طلب میں۔۔۔۔۔ نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا، نہ کسی کے دل کا قرار۔۔۔۔۔ مجھے ٹیس پر بیٹھے جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل کر شام کورات کی سیاہ چادر میں لپیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی ضد کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے تھے، پتے دوست۔۔۔۔۔ تبھی تو جب دن شدید ٹھکنے سے چور ہو کر شام تک بٹھانے لگتا ہے، تب شام اپنی مہربان سبیلی، رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندھے دن کو سمیٹ کر سلامتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھرپور دن آنکھیں موندے سویا رہتا ہے، بس ہمیں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آکر بتایا کہ کمائی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمائی ٹیس پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ ہلکے لباس میں لبوس تھا۔ ”یہ کیسا سر۔۔۔۔۔؟ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم

ہاؤس جانا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔“ میں نے جان ٹھورانے کی کوشش کی۔ ”میرا مومڈ نہیں ہے کمائی، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کروینا۔۔۔۔۔ کمائی گڑبڑا سا گیا۔“ نہیں سر! اچھا نہیں لگے گا، سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے اور پھر ہمیں وہاں، اپنے نئے ٹینڈرز کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر۔ یہ میل جول رکھنا ضروری ہے۔“ میں نے بادل نخواستہ خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھٹنے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گامزن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھریا جائادہ ہونے کے باوجود، کسی ویرانے میں ٹیکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ایسی ہی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا اسٹیٹس سمبل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پردے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت، جس کے آس پاس مصنوعی نہر اور فواروں کے ذریعے پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ اس کی جبلت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں بخت کا تصور بھی تو بہت ہی نہروں، ٹھنڈے چشموں اور گھٹنے

سایوں ہی کی صورت نقش ہے۔ سارا فارم ہاؤس برقی قلموں سے جھکا رہا تھا، بارہائی کیو کا بندوبست بھی باہر بزم سے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر لگتا تھا کہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ سچی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے فٹے ایک بہت بڑا آرڈر مینڈر کرنے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھیکہ دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود سبھی کا رو باری طبقے اس ٹھیکے میں دل چسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیٹھ رحمان پچاس پچپن سالہ

ایک گھاگ اور حقیقتیں مزاج شخص تھا، جسے باتیں بنانے کے فن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فردا فردا سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے یہ بتانے میں قطعاً عارحوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دل چسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سیٹھ رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو بھی خوش کر رکھا ہے۔ ”کیا بتاؤں سر جی..... یہ اپنے رحمان صاحب تویاروں کے یار ہیں، بڑا ہلکا گھڑتا ہے، ان کے فارم ہاؤس پر۔ صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس ان ہی کی دل دادہ ہے، آج بھی جو کافی مسفرز اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان ہی کا کمال ہے۔ کبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمان صاحب سے سیکھے۔“ کمالی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے اپنے طور پر طے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلک کرتے ملبوسات میں خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اخلاقی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور ”دوست“ اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقتدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور خواتین الگ الگ حصوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دولت اور پیسا تو ان کے پاس آج کے ان وقتوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے جا بنی ہمارے معاشرے میں کہاں سے ڈرائی۔ چونکہ انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا اختتام بھی پتھر کے دور ہی پر ہوگا۔ دیرسانی مدت مکمل عروج اور پھر یک سر زوال کا محض ایک دورانیہ ہی تو ہے، کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار گزار سکے، مگر شام ہوتے ہی ہم میں سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنوئیں میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے ارد گرد مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھوٹی بے خودی۔

میں نے اکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ ”اتنی جلدی سر..... کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔ سیٹھ رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چن دیا جائے گا۔“ میں نے اکتاہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ”ہماری حاضری لگ گئی ہے، تم اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ کمالی نے سر ہلایا اور سیٹھ رحمان کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ابھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رحمان، کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈنگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ ”یہ کیا پی، زیڈ صاحب! آپ ابھی سے چل دیے۔ ابھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے بھیگی بھی نہیں.....“ میں دیر سے سے مسکرایا۔ ”میں شام دیر تک اوس میں بیٹھتا رہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ بھینکے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں میں۔“ سیٹھ میری بات سن کر زوردار قہقہہ لگا کے ہنسا۔ ”خوب..... بہت خوب..... بھئی میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں، صرف ایک میں ہی بذلہ رنج باغیچا ہوں، مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی واپس نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔“ میں نے بہت جان ٹھہرانے کی کوشش کی کہ ”کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے مینٹگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سیٹھ رحمان اڑ گیا۔“ نہیں بھئی، ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، شہ پارہ بیگم..... چوٹی کی ایکٹر لیس ہیں..... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے فلم انڈسٹری میں۔ ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیر یہ مراسم کا خیال ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ لیس، شاید یہ ان ہی کی گاڑی ہے، وہ آ گئیں، آپ بس دو لمحے انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے ان سے..... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔“ سیٹھ رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے من ہی میں چل کر رہ گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سیٹھ رحمان ایک زرق برق، ناز وادا کے پیکر کو لیے میری طرف آنا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام شہ پارہ نہیں تھا۔ شہ پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

(جاری ہے)

بائیں ہم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سزے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہنا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رقیوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتہ وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguroup.com.pk

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لفظی تھی۔ ہاں وہی میری یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور طرح دار لفظی، جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کباڑیے سے ہوئی تھی، سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کروانے میں مصروف تھا۔ ”شہ پارہ بیگم! ان سے ملیں، یہی ہیں، پی زیڈ صاحب اور؟“ کل کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہ پارہ... ہمارے ملک کی نام ور آرٹسٹ، پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں۔ آج ہم نے خاص؟ پ سے ملاقات کے لیے انہیں مدعو کیا ہے۔“ لفظی پُپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ”ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے رحمان صاحب، مگر تب یہ پی زیڈ نہیں تھے اور نہ میں شہ پارہ“۔ سیٹھ وطن کو شہ پارہ کی بات سن کر حیرت کا ایک جھٹکا لگا ”ارے... واقعی... بھئی پی۔ پی زیڈ صاحب، آپ تو واقعی تجھے رستم لکھے، جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہر نایاب سے دوستی کا شرف صرف ہمیں ہی حاصل ہے۔“ لفظی عرف شہ پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھ کر بغیر کہا ”ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے رحمان صاحب... پُرانے چھڑے ہوئے ملیں، تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان“۔ سیٹھ رحمان لفظی کی بات سن کر ہڑ بڑا کے بولا ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، آپ لوگ باتیں کریں، میں لکھنا لکھنا کا انتظام کرتا ہوں“۔ سیٹھ رحمان جاتے جاتے بھی ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ لفظی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آگئی، ”پری زاد... یہ تمہی ہوں! مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا، تو تم ہوشہر کے وہ ننہ بگ شاٹ، بڑے صنعت کار، میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے، مگر ایسا میں نے صرف فلموں ہی میں ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فاتح ہو پری زاد...“ میں نے لفظی کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوب صورت اور جاذب نظر تھی، بلکہ اس کے حسن میں اب اداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھر دیا تھا۔ حسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔ ”نہیں، نہیں کبھی فاتح نہیں رہا، بس باراتی آیا ہوں، مگر تم اور یہ شہ پارہ، یہ سب کیا ہے، تمہارا شوہر کہاں ہے، وہ سیٹھ عابد...؟“ لفظی دھیمے سے مسکائی ”سیٹھ عابد ایک کامیاب سوداگر تھا۔ اسے جب تک شادی کے سودے میں اپنا فائدہ نظر آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب نو دسیت سا رمانافع وصول ہو گیا، تو تین لفظ کہہ کر آزاد کر دیا۔ تم نہیں جانتے پری زاد، اُسے سودے بازی خوب آتی تھی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا۔“ لفظی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”اوہ! اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا ناں، مجھے ہمیشہ اس کے نام سے جھکی اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھٹک نظر آتی تھی، مگر میں خود کو کبھی یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دکان دار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو؟“ میں نے لفظی کی سیاہ غرائی آنکھوں میں تجھے سوال کا جواب دیا۔ ”ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کامیاب سوداگر تھا۔ اُسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا، بیچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پری زاد سے پی زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے، یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کایاں شخص دکھائی دیتا ہے، اور تم اس کی خاص مہمان ہو، یہ سب کیا ہے؟“ لفظی نے ذور کھڑے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھا، جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ”یہ سیٹھ بھی ایک کامیاب دکان دار ہے، اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے؟“ ج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصروف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے۔“ میں نے دکھ سے لفظی کی طرف طرف دیکھا۔ ”اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں، پھر... پھر کیا ہوتا؟“ ”کچھ زیادہ نہیں، میری پتی کبھی عزت نفس کو مجروح کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے پیش کر دیا جاتا، کیوں کہ میری ماں دنیا سے جاتے جاتے اتنے ادھار میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی۔“ اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ”مخل ہونے کی عذرت چاہتا ہوں، مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہ پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدردان ہیں، ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو کسی سے نہیں کرتیں۔ ہم تو بات کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب...“ میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ”نہیں سیٹھ صاحب! اب میں چلوں گا،؟“ آپ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔ کل؟ آپ اپنے منیجر کو میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا اور یہ کیا، اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں، میری طرف سے ہاں ہی کہیے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی؟“ آزادی درکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے گھانے کا سودا نہیں ہوگا۔ اگر منظور ہو تو اپنے منیجر کو قیت بتا کر بھیجے گا۔“ میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا اور سیٹھ رحمان ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مڑتے وقت میں نے لفظی کی آنکھوں کی نمی، اپنی؟ آنکھوں میں اتنی ہی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری چٹکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے اُجلی اور؟ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک لیے یہ دنیا اندر سے کبھی کبھی کتنی تاریک اور سیاہ لگتی ہے۔

اگلے روز سیٹھ رحمان کا منیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کامیاب سوداگر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر انسانی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمائی بچھلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز سیٹھ رحمان کے منیجر کے جانے کے بعد اپنی پُپ پر قابو نہیں رکھ پایا ”اگر آپ بُرا نہ مانیں سر! تو میں ایک بات کہنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں، عہدے اور زبے میں؟ آپ مجھ سے بہت بلند ہیں، مگر غم میں، میں آپ سے بڑا ہوں۔ لہذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں۔“ میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سنی۔ ”مختی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، تم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے۔“ کمائی میری بات سن کر سٹ پنا سا گیا۔ ”جی سر... میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی پیسا ہے، اور اسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف؟ ہی کو ہے، مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں؟“ اتنی؟ میں جب آپ کو یوں بے دریغ دوسروں پر پیسا لٹاتے دیکھتا ہوں، تو نہ جانے کیوں بہت ڈکھ ہوتا ہے۔ غمیں لگ جاتی ہیں، یہ پیسا کمانے میں۔ اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے۔ اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے، تو میں معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھا۔“ کمائی بات ختم کر کے پُپ ہو گیا۔ ”تم نے ٹھیک کہا کمائی! مجھے سودے بازی نہیں آتی، اچھا سوداگر نہیں ہوں میں۔ انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں

امام کی باجیوں کو ڈانٹنے اور سکھڑا پے کے گر سکھانے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ابامعین میں اپنا حقہ سنبھالے لکھائے اور اخبار پڑھتے رہتے۔ میں مٹی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلونا موٹر کار کے لیے راستے بناتا رہتا اور دن میں موسموں میں اس زنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چپکا کر ہٹا، ایک لمبے ہی میں میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر پھلکا کہ وہ سب لمبے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت ابا کے حقے کا کڑوا دھواں اور باورچی خانے سے آتی گرم نمکھلوں کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ کاش میں ساری زندگی وہی پانچ چھ سالہ پُری زاد ہی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم آتی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے پُری زاد ہی تو ہوتا ہے، تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی پُری زاد رکھ دیا، تو ایسا کیا گناہ کیا۔ میری؟ نکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی؟ آواز بھی محسوس ہوئی۔ ”پُری زاد... بیٹا... تم پُری زاد ہی ہونا“ میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابا کی آواز سمجھا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی؟ نکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر کھلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار گلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھپا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور پُری یادوں کے سب درتچے وا ہو گئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور پُری باتیں یاد کر کے سبھی بیک وقت خوش اور غم کین سے ہو گئے تھے۔ گویا یاد ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی، اور بھی بہت تھی، جو اس عذاب سے دو چار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر جبران اور دل سے خوش نظر آرہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی

بڑے دل چسپ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں، زیادہ تر ایک دوسرے سے فخر اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، مگر انہی میں سے جب کوئی ایک چمچ کر کہیں اور چلا جاتا ہے اور عرصے بعد ملتا ہے، تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اُسے یاد کرتے ہوئے یوں استقبال کرتے ہیں، جیسے وہ ہم سایہ نہیں، کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر ہی خوب صورت کیوں بن جاتے ہیں؟ فاصلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گھر کو دھندا ہے؟ گھڑ والے منظور چچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں پڑی زاد بیٹا! وہ مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا۔ بہت بیمار رہتے ہیں آج کل، ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا نام سننے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگا ہوا بھلا بھلا آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا اور تب ہی اچانک ہی وہ!؟ نفی جان، ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہوگی؟ محلے کے بچے میری گاڑی کے گرد جمع تھے اور ڈرائیور انہیں بھگانے کے لیے مختلف طریقے آزمایا رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے دک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر فحشی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے تماشے ہیں۔ میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی! ہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا، تو اس کی نظر مجھ سے پہلے ڈور کھڑی میری کار پر پڑی، اور پھر میری نظر، اس کی نظر سے ملی تو جیسے سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گڑبڑ ای گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ”آپ!... آپ پڑی زاد ہیں ناں۔ مجھے ہم سانیوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔“ ناہید کے بال الجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور چہروں میں پُرانی چٹیل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فریہ لگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نٹ کھٹی لڑکی، مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں بہ مشکل ڈھونڈنے سے حصے بجزوں میں بٹی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پنا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ”آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں۔ اب گھر پر ہی ہیں۔“ میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ وہ یہی صحن تھا، جہاں میں کبھی شام کو گھنڈ بھر کے لیے ناہید کو ٹیوشن پڑھانے انکوری تیل کے سائے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی تیس گھنٹے، اُسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزار دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے بچے شورا اور ادھم چارہ تھے۔ ان میں سے ایک نے گھر سے پرکھا جیتل کا گلاس زور سے کپے فرش پر گرا دیا، تو شور مچ گیا۔ ناہید نے غصے میں اس بچے کو دھڑکڑ مارے اور شرمندگی سے چلائی۔ ”چپ کر جاؤ کم بختو! دیکھ نہیں رہے، گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو، نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر کھیلو۔“ بچے منہ بسورتے صحن سے نکل گئے۔ اندر سے مرزا صاحب کھانسنے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ”کون آیا ہے، ناہید بیٹا...“ ناہید نے جلدی سے صحن میں

پڑی پُرانی کرسی میرے لیے سیدھی کی ”پڑی زاد!؟“ اے ہیں اباجی، ہمارے پرانے ہم سائے۔“ مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ”ارے پڑی زاد بیٹا! کیسے ہو تم، تمہارے بھائیوں سے پتا چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو۔ اچھا کیا آ گئے، تمہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا۔“ مرزا صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت الجھی ہوئی اور بے آرام سی دکھائی رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ”ارے ہاں، یاد آیا۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی تھی میاں۔ بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے، دکھائی نہیں دے رہا۔“ مرزا صاحب نے نہ اسامہ بنایا ”ارے ہوگا کہاں...“ کہیں نوکری کی تلاش میں در بدر بھٹک رہا ہوگا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ بیٹوں اپنے بیوی بچوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے، مگر کچھ جہاں نہیں!؟ ج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔“ ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ”بس کریں اباجی، یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے؟“ ”نہیں کن اکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا زوپ کیوں بدل لیتی ہیں، یا پھر شاید، ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اس کے لیے ناہید اب بھی اتنی ہی دل کش اور خوب صورت ہو۔ کہتے ہیں حسن جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے، تو عموماً اپنا اثر کھودیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا، اس لیے شاید میں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا محبوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ میری غزل اور خیام کی رباعی کو کسی سر آپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی، اتنے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں اٹا ایک تھکا ہارا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے ماتھے پر تیوریاں سی پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبرا سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی ”ارے ماجد... تم آئے... دیکھو، پڑی زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پچپان نہیں تم نے انہیں۔“ ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)



ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسم“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت روتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوتا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شہید غصے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ارے پُری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پُری زاد ہی ہونا..... معاف کرنا، میں جھکن کی وجہ سے پہچان نہیں سکا۔“ شاید ماجد بھی میرے قیمتی اصلی لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آگیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو بیانیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہ جھاری تھی۔ بہت تھکا کاندہ سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسے ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے غم بھر کے لیے خاکستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غم دوران کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر میں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ”میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا“، ”میں آپ کا دل نہیں دُکھانا چاہتی تھی“ ”آپ دل کے بہت اچھے ہیں.....“ وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وہ ضاحک اُنے اٹھاؤ مندل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے لیے گھلے زخم لیے گھرواپس پہنچا، تو رات دھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سونمگ پُل کے پاس کچھ فائلز گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائلز اُسے واپس کیں ”صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا جوہل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔“ کمالی سُر تھکائے کھڑا ہوا۔ ”مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سُر..... آج صبح میں نے سینٹر رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک بیلے نے مجھے عزت نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگ گائیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں۔“ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ”بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہونہ ہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے۔“ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ”کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”ہاں سُر! بڑا زوردار شوق چلا تھا تو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخر کار۔“ میں نے گھبرا کر پوچھا ”کیوں..... کیا ہوا تھا؟“ کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ہونا کیا تھا سُر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ سارا شوق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھریلو وزمرہ خرچوں، بچوں کی فرمائشوں اور فیصوں سے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی۔“ کمالی اپنے دکھڑے سنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالنا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم جلتا ہوں یا غیر جلتا، یہ محبت ہر تیل ہمارے اُس پاس کن سونیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش نہ چا سکے۔ میری یہ خُسن پرستی بھی تو اُسی قسم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے اُس پاس خُوب سُر ت چروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے محلے میں، دینی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی لگتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی اُمتنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ فحاش پسند، کچھ کونا زک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں خُسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائنس ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگادیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول ملے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سُر کیس سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کپیٹر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی مٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دوبول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سُننے میں گونج رہی تھی۔ ”جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان“ ”مگر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....“ اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ”جی سامعین! یہی تھی میرے پسندیدہ شاعر، پُری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنگنائی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک گلہ بھی ہے۔ میں اُسی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پُری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ ملفظوں سے اپنا ناتانہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان



ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبسم“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت روتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہمارا ہوتا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شہید غصے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ارے پُری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پُری زاد ہی ہونا..... معاف کرنا، میں جھکن کی وجہ سے پہچان نہیں سکا۔“ شاید ماجد بھی میرے قیمتی اصلی لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آگیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو بیانیہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہ جھاری تھی۔ بہت تھکا کتا سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسے ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے غم بھر کے لیے خاکستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غم دوران کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر میں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ”میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا“، ”میں آپ کا دل نہیں ڈکھانا چاہتی تھی“ ”آپ دل کے بہت اچھے ہیں.....“ وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو اُنے اُنے گھاڑا مندل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے لیے گھلے زخم لیے گھرواپس پہنچا، تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سونمگ پُل کے پاس کچھ فائلز گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائلز اُسے واپس کیں ”صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا جوہل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔“ کمالی سُر تھکائے کھڑا ہوا۔ ”مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سُر..... آج صبح میں نے سینٹھ رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک بیلے نے مجھے عزت نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگس گئے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں۔“ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ”بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہونہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے۔“ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ”کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”ہاں سُر! بڑا زوردار شوق چلا تھا تو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخر کار۔“ میں نے گھبرا کر پوچھا ”کیوں..... کیا ہوا تھا؟“ کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ہونا کیا تھا سُر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ سارا شوق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھریلو روزمرہ خرچوں، بچوں کی فرمائشوں اور فیصوں سے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی۔“ کمالی اپنے دکھڑے سنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالنا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم جلتا ہوں یا غیر جلتا، یہ محبت ہر تیل ہمارے آس پاس کن سونیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش نہ چا سکے۔ میری یہ خُسن پرستی بھی تو اُسی قسم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خُوب سُر ت چروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے محلے میں، دینی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی لگتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی اُمتنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ فحاش پسند، کچھ کتنا زک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں خُسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائنس ایری والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگادیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول ملے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سُر کیس سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کپیٹر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی مٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دوبول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سُننے میں گونج رہی تھی۔ ”جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان“ ”مگر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....“ اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ”جی سامعین! یہی تھی میرے پسندیدہ شاعر، پُری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنگنائی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک گلہ بھی ہے۔ میں اُسی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پُری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ ملفظوں سے اپنا ناتانہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسندیدہ پروگرام ”بزم ادب“ کے ساتھ حاضر ہوں گے، تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے، شب بخیر۔ میں پروگرام سننے میں اس قدر مگن تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر کروش بدلتے، اُن گت سوچوں میں گزری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اُس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونی ورسی کے سالانہ رسالے میں چھپ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت بنی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونی ورسی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی خفا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ٹالنا آتا تھا۔ مگر اس روز ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ لے کر ہی انھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی شام یونی ورسی کی بزم ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی مہمان خصوصی کے طور پر درج کروا کے آئے تھے۔ میں نہ ہی کر تارہ گیا، لیکن وہ ممکن دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پسینے ٹھوٹے نکلے ہیں۔ وہی چھٹی نظریں، جو مجھے اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دہی دہی سرگوشیاں، طنز یہ مسکرائشیں، کاش احمد صاحب میرے اس دل ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے، مگر یہ ہونہر کا اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈکس پر میرا نام پکارا گیا تو میں نظریں اٹھ کھائے مائیک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں قماشائیوں کی جانب روشنی ملگئی سی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی روکی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا، اپنی سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحوں کا عرصہ مل گیا۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلبہ اور دیگر عملہ انہماک سے میری بات سُن رہا تھا۔ ”میں کوئی شاعر، مقرر یا لیڈر نہیں ہوں..... بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جوتی ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا ٹھکر گزار ہوں، جنہوں نے سالانہ نشائے میں میرا تعارف اور چند پُرانی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا۔ یہ اشعار دراصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحت پر آگئیں تو آپ لوگوں سے بانٹ لیں۔ آپ لوگ اسے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسن ظن اور ظرف ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو ذرا کھٹکھٹاؤ میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگا، ایک تھلی سی لڑکی کھڑی ہو گئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا مائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔ ”سر! میرا قراۃ العین ہے۔ میں اسی یونی ورسی میں فاضل ایڈز کی طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر ”بزم ادب“ کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سننے والوں کی ایک بڑی تعداد تک آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونی ورسی کے بعد تازہ کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا نانا حروف سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”جی ضرور..... اگر غم دوراں نے کچھ مہلت دی تو.....“

ابھی اک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سُنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی، کبھی کبھی وقت کی چالیں بھی کتنی غبی تلی ہوتی ہیں۔ تقدیر اپنا مسکر پٹ کیسے دھیمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقرر کا یہ مسودہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیاس تیا ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر روانہ ہوا تو کمالی سے رہائشیں گیا۔ ”سر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونی ورسی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں۔ مجھے خود بھی حیرت ہے۔“ اس میں حیرت کی کیا بات ہے سُر جی..... یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دل چسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون پر بھی ہر دم ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ میر، درد، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سُر۔ بظاہر بڑی لالچالی ہے یہ نئی نسل، مگر اپنے مطلب کی چیز پر ہستی اور ہستی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح.....“ میں چُپ رہا۔ ”ارے ہاں یاد آیا، وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھا تھا اسے نمبر تو دے دیا ہے، مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کر لے۔“ اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر جکمانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ ”معاف کیجیے گا سر! شاید آپ کے منیجر نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے بنی ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں..... ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....؟“ میں نے کچھ لمحوں کو وقف کیا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ.....؟“ وہ مومنیت سے بولی۔ ”کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کامیابیوں کے بارے میں، آپ کی ادب دوستی کے بارے میں۔ سُنا ہے، شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں، عام طور پر ادب سے مجھے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دُور سمجھتا ہے۔ یہ ادیب، شاعر عموماً مفلوک الحال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھایا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانتا چاہتی ہوں۔“ میں اس کی باتیں سُن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ ”مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟“ وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دُور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بچ اٹھی ہوں۔ ”احمد سُر نے بتایا، اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت متجسس رہتے ہیں آپ کے بارے میں.....“ وہ اپنی دھن کی پٹلی لگتی تھی۔ میرے لاکھٹا لٹنے کے باوجود، مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کامیاب ہوئی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں جتلا رہا کہ رات، اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شام تک یہ الجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو یعنی کا دی فون نمبر ملانے کو کہا، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر جگمگا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی، تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھلکھلائی سی آواز سنائی دی۔ ”ارے سُر آپ.....؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے خود مجھ سے کال کی ہے، میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیسے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟“ ”جی سُر، کیوں نہیں..... مگر کوئی خاص وجہ.....؟“ ”پتا نہیں، وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت الجھن ہی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔“ دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ ”ٹھیک ہے

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانسٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیز“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت روقوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پلاس کہتی ہے، اب ریت نچوڑی جائے
اپنے حصے میں سمندر نہیں آنے والا

میں سکتہ زدہ سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور وہ روتی رہی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میرا بے وقوف دل مجھ سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ صدیوں بعد جس ایک نظر پر اُسے اپنے ہونے کا گمان ہوا تھا، وہ نظر تو سدا کی بے نور تھی۔ اور میں نہ جانے کن خوش فہمیوں کا شکار ہو چلا تھا۔ ”میں آپ سے معافی نہیں مانگ سکتا.....“ جانے غصے میں کیا کچھ کہہ گیا۔ میرے اندر کا چور تھا، جو پُچپ نہیں رہ سکا۔ ”یعنی نے سراٹھایا۔“ آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں، میں نے آپ کو ہمیشہ آپ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھا ہے۔ اور میں نہیں مانتی کہ اتنی خوب صورت سوچ رکھنے والا شخص بد صورت ہو سکتا ہے، دوبارہ ایسی بات کہی نہ کہیے گا۔“ میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرے کہنے یا نہ کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ سچ وہی ہے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس داغ دار چہرے کا مجسمہ بنا تو جو بات آج تک صرف میرے ارد گرد والوں کے علم میں ہے، کل سارے شہر میں پھیل جائے گی، اور لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ پُر ی زاد کو کیا سوچھی؟“ یعنی نے اپنا چشمہ دوبارہ اپنی آنکھوں پر جمایا اور کھڑی ہو گئی۔ ”میں دیکھ نہیں سکتی، اپنی انگلیوں کی پوروں سے چیزیں چھو کر انہیں مٹی کے مجسموں کے قالب میں ڈھالتی ہوں، مگر آپ کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنی پوروں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پُر ی زاد..... آپ کے لفظ خود آپ کا تعارف ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”دل کے بہلانے کو، یہ خیال اچھا ہے۔ مگر میری تم سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو قرآن العین۔“ وہ پلٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رُکی۔ ”میں اپنی گیلری میں آپ کا انتظار کروں گی پُر ی زاد.....“ وہ پلٹ کر چلی گئی اور میرے کمرے میں صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔ آج میں نے پہلی بار اسے آپ نہیں، تم کہا، اور اس نے پہلی بار مجھے سُرا یا صاحب نہیں، صرف پُر ی زاد کہہ کر پکارا تھا۔ یہ طرزِ مخاطب اور القابات بھی تو ہمارے اندر کے بدلتے رویوں اور رشتوں کا ایک اظہار ہوتے ہیں۔ دل کی ہنسی بولیاں اپنے القاب خود طے کرتی ہیں۔

اگلی شام میں جھجکتے قدموں کے ساتھ یعنی کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گھر کے نچلے حصے میں یعنی اور اس کی ماں رہتی تھیں، جب کہ اوپر والا حصہ انہوں نے کسی چھوٹے خاندان کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ یعنی کے والد کافی عرصے پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے اور اب یہی کرایہ ان کی بیٹی کی گزربس کر ڈیرہ تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں یعنی نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری بنائی تھی۔ مجسمہ سازی شروع کرنے سے پہلے یعنی نے اپنی نازک مہکتی انگلیوں سے میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ ٹھنڈک اور بے پناہ سکون کا ایک سمندر اس کے پوروں کے لمس سے میرے سارے وجود کی گہرائیوں تک سرایت کر گیا۔ میری جھلمکتی، تپتی روح کو جیسے خشک برف کا نخلستان سائل گیا۔ میری تمام عُمر کی ریاضتوں کا حاصل۔ وہ اس کے ہاتھوں کا مہربان لمس..... یعنی نے کام شروع کر دیا۔ میں پُچپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجسمہ بنانے میں تین چار دن لگیں گے۔ میرا بی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ تین چار صدیاں کیوں نہیں.....؟؟ میری زندگی میں وہ پہلی مدوشت تھی کہ جس خوش ادا کی اتنی قربت اور نزدیکی مجھے شرمندہ اور پریشان نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ اتنے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی طرح اُس کی نظریں میرے چہرے کے آ پار نہیں ہورہی تھیں۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی مخصوص طنز یہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ عام طور پر جیسے ہی کوئی میری طرف نظر بھر کر دیکھتا، میری نظر اگلے ہی پل خود بخود جھک جایا کرتی، لیکن یعنی کے کوئل چہرے کو گھٹنوں دیکھتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ مجھے اس سے نظر ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ کتنی بڑی آزادی تھی یہ میرے لیے۔ یہ کوئی مجھ جیوں سے پوچھتے۔

ساری رات بستر پر کر وائیں بدلتے میں اگلے دن اور پھر شام ہونے کا انتظار کرتا رہا، جب مجھے دوبارہ یعنی کی گیلری پہنچنا تھا۔ صبح سے دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پہروں کی طوالت پر شب ہونے لگا۔ یہ دن کو چار پہروں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے؟ پہلا پہر، دوپہر، سہ پہر اور پھر شام۔ کیا ضرورت تھی، بھلا وقت کو اتنے حصوں میں بانٹنے کی، بس صبح ہوتی اور شام ہو جایا کرتی، تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مزید بے سرو پا خیالات میرے ذہن میں جالے بن رہے تھے، جب اچانک پی اے نے انٹر کام پر مجھے بتایا کہ میڈم شہ پارہ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں شہ پارہ کو اپنے دفتر پا کر کچھ حیران سا تھا۔ میرے لیے وہ آج بھی وہی پرانی لٹھی تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ”میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں پُر ی زاد.....“ میرا فکری کیریئر سیٹھ رحمان کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ کیا تم میری سفارش کسی بڑے پروڈیوسر سے کر سکتے ہو؟ بڑی دھماکا ہے تمہاری شہر میں، تم کہو گے تو میں پھر سے اپنے قدم جمانے میں کام یاب ہو جاؤں گی۔“ میں نے ابھن سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میں تو کسی بڑے پروڈیوسر سے واقف بھی نہیں ہوں لٹھی.....“ وہ مایوس ہو گئی ”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جانے میں کس پریشانی میں بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ تمہارا کاروبار اور فلمی دنیا بالکل جدا ہیں۔“ وہ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”مظہر لٹھی! تم ہوتا تو میں خود تمہاری فلم میں سرمایہ کاری کر سکتا ہوں۔“ کتنے میں بن جاتی ہے ایک معیاری فلم.....؟؟“ وہ خوشی سے بے یقین ہو گئی۔ ”سچ تم خود پروڈیوس کرو گے میری فلم۔“ وہ..... اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے، مگر اس کاروبار میں آج کل نقصان کا زیادہ خطرہ رہتا ہے پُر ی زاد، میں ڈرتی ہوں کہیں تمہاری رقم یہ نڈوب جائے۔“ تمہیں کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے فلم پروڈکشن کا.....“ میں نے مسکرا کر اس کی زلف پریشان کے خم کو دیکھا۔ ”چلو اس بہانے رقم ڈوبنے کا قیمتی تجربہ تو حاصل ہو جائے گا نا! تمہاری فلم کے بدلے یہ تجربہ بھی سہی۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ فلمیں دل سے بنائی جاتی ہیں، دماغ سے نہیں، تو پھر دل کی سوود میں نفع و نقصان کی فکر بھلا کیسی؟ دل کا ملوٹ ہونا ہی خسارے کی نشانی ہے۔“ لٹھی کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فرط جذبہ میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں، میں تمہارا نقصان نہیں ہونے

دووں کی پُری زاد..... میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ..... میری زندگی کی سب سے یادگار پرفارمنس ہوگی اس قسم میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، اگر تمہیں پسند آگئی، تو میں راسخ سے کہانی پر کام کرنے کا کہہ دوں گی، مگر تمہیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کروں گی۔“ لہٰذا چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح یعنی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مٹی گوندھتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بُت بننے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا انداز بیان کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ذہنی شاموں اور راتوں کے طلسم کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں یعنی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس نئے پُری زاد کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، راستے ہی میں چند بوندوں نے فیک کر میری گاڑی کی وینڈ اسکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی، ہنستی ہوئی برقی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جا ملیں۔ کیر خان حسب معمول چوکنا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا درگرو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتنے میں لہٰذا کا نمبر میرے سیل فون پر جگمگانے لگا۔ ”پُری زاد..... کہاں ہو تم؟“ ”جنوبی شہر کے اجنبی راستے..... اور میں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”اسٹوڈیو آسکتے ہو ابھی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔“ میں نے کیر خان کو اسٹوڈیو چلنے کو کہا۔ ہم ویران سے فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے چلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومنے نظر آئے۔ عجیب سی آوازیں اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ برپا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا پمپل دیکھ کر وہ سب کچھ جڑ بڑے ہو گئے۔ میں نے کیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جمنا کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سارے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لہٰذا نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص

بارمونیم سامنے رکھا بیٹھا تھا اور اس کی آڑ میں سٹائی ایک شرمیلی لڑکی، چھوٹی موٹی سی بنی بٹھی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھا رہی تھی۔ باقی لوگوں کی جھپٹی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا، مگر ابھی تک وہ وہیں دیکھی بٹھی تھی۔ لہٰذا نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں کئی ہوئی لڑکی سنبل ہے، استاد بنے خان کی بیٹی اور آج وہ دونوں لہٰذا کی آنے والی فلم کی ڈھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک پختی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا، جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ ”بس پُری زاد صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، کبھی یہی فلم اسٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی، کہیں اندیم صاحب، تو کہیں محمد علی صاحب۔ کہیں شاہد تو کہیں وحید مراد، کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فورہ آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں، یہاں تو بہ یک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا، سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ سیکڑوں کاری گراور ان کے خاندان بے روزگار ہو گئے۔“ وہ مزید ہٹاؤ کے یوٹی بوتلا رہتا، اگر لہٰذا اسے اشارہ کر کے روک نہ دیتی۔ لہٰذا ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر موز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کا نکتہ کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی چوٹیوں اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنے خان اپنا بارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبل بھی استاد کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ چھیڑ دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی سُری تھی اور گھلے میں بٹا کا لوچ تھا۔ وہ گانے کے دو بول دہرائی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہر نی جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی کہ میں دل چسپی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فن کو ہمیشہ سناس کی تمنا رہتی ہے اور شاید فن کا رکاواپنے قدر دانوں کی نظریں پڑھنے کا فن آتا ہے۔ ”جب بارش کی پہلی بوند گرے..... تم چلے آنا..... میرا سندیہ ملے نہ ملے..... تم چلے آنا.....“ باہر برستی بارش کے جلتارنگ کے ساتھ مل کر استاد بنے خان کے سُراور سنبل کی ریلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی۔ اے کر لیا ہے، مگر اب وہ اسے اپنے آبائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ بیگم نے انہیں اپنی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی، ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے یقیناً کسی بہت بڑی مجبوری نے یوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے لاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فن پسند آیا، تو میرے لب کپکپاے گئے۔ ”یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سُنا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی جانچ کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنرمند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے۔“ استاد بنے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لہٰذا نے موضوع بدل دیا۔ ”آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹر جی..... پُری زاد صاحب کی یہ پہلی فلم ہے۔“ استاد بنے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا ”ہاں، پر ادب والے ہیں۔ شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں۔“ میں نے لہٰذا سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی حقارت ہے۔ مجھے ان بکھیزوں سے دور رہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری بینک رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنے اور سنبل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو پتا چلا کہ کسے یاگیسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تار یک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلنے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے یعنی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھا کو بچہ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سُنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے یعنی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔ ”فلم..... واہ..... پُری زاد میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹریں ہوں گی۔ ساری سچاوت میری طے کردہ ہوگی، بریٹ پر میری بنائی ہوئی صورتیں ہوں گی، ٹھیک.....؟“ ”ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر پہلے میرا جمدہ تو مکمل کر دو۔ کہیں اس فلم کے جھیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے۔“ وہ میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑی۔ سنا نے میں یک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی، تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹوڈیو کی طرف موڑنے کا کہا تو کیر اپنے چہرے کے تاثرات چُھپا نہیں پایا۔ ”صاحب! اجازت دو تو ایک بات

بولے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں بولو.....؟“ وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے ذرا سا کسمسا یا ”صاپ“ ایلم اسٹوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا.....“ میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ تبھی اپنی زبان کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا اینڈر میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا مقناطیس اپنے جوبن پر تھا، جو مایا کا کوئی بھی ذرہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا تھا اور یہی بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسب معمول چند آوارہ رشتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد بٹے اور سنبل نے تیار کردہ ڈھنوں پر کچھ گیت گنگنائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیانا نہ لگی۔ لہٰذا نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ”پڑی زاد..... تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے۔“ سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے

جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوالیں۔“ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ ”اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ دنیا داری سے نا نا نہیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، ہو سکتے تو.....“ وہ کہتے کہتے پُپ ہو گئی۔ ڈائریکٹر نے منہ بنایا ”دیکھ لیں گے اُسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری ٹھپا بیٹھا ہے اس کے اندر؟“ لہٰذا نے شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بٹے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لیتے ہیں اس شاعر سے، ڈائریکٹر ہلکا سا گیا۔ ”ارے کیا بات کرتے ہیں سرجی..... آپ کیوں جائیں گے، وہ خود آئے گا یہاں۔“ میں نے اس کی سُنی اس کی سُنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ چاک چندر لوگ ”شاہ جی..... شاہ جی“ کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد بٹے نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوش اور عزت سے بٹے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی، تو بٹے خان نے مجھے بتایا۔ ”یہ سید نور صاحب ہیں..... پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی اچھی فلم بن رہی ہیں، بھاجن“۔ گاڑی بٹے خان کے اندر سے محلے میں پہنچی تو میں بھی باپ بیٹی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے رُک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا ”اندر آجائے صاحب، مزاروں کے دروازوں پر دستک نہیں دی جاتی۔“ میں، سنبل اور بٹے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لائین کی کم زوری روشنی نے شایلا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ بٹے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ”کبھی ہم خود کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں.....“ بان کی جھلگی سی چار پائی پر لیٹا وہ کم زور سانو جوان اٹھ بیٹھا۔ ”معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہٰذا.....“ وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہو گئی اور وہ بے تاب بنی کھڑا ہو گیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا ”پڑی زاد..... یہ، یہ تم ہی ہونا.....“ میری آنکھیں نم ہونے لگیں ”کیوں.....؟ یہ چہرہ دیکھ کر مجھے بھی پہچانا کیا، صرف لباس و حلیہ بدلا ہے میرا۔ مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں نا ساز.....“ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یا! اپنے دوست کو بھی بھلا دیا۔“ بٹے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشانی سے ہم دونوں کو گھل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ نا ساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست، جس نے میرے اندر اچھی شاعری کی چنگاری کو ہوادے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے نا ساز سے کہا ”آپ انہیں جانتے ہیں، میں فلم کے پروڈیوسر ہیں پڑی زاد..... اور میں نے ان ہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو کہا تھا آپ سے.....“ نا ساز حیرت سے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا۔ ”یہ کیا انقلاب ہے پیارے، سب فتح کر لیا کیا میرے شہسوار؟ تو تو واقعی فاتح نکلا“۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ”نہیں..... اب بھی ہار رہا ہوں، بس سونا چاندی جمع ہوتا جا رہا ہے زور ارہ کے طور پر، دل اتنا ہی ویران اور ناکارہ ہے اب تک۔“ وہ زور سے ہنسا ”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا.....“ بٹے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ نا ساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کم زور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سن رہا۔ اس کے آس پاس دواؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ ”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے نا ساز..... کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکائیوں بستر سے لگا پڑا ہے۔ سب خیر تو ہے نا.....“ وہ پچھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یاد ہے، کالج کے دور میں ہم نے بھپ کر ہاسٹل میں وی سی آر پر فلم دیکھی تھی ”منک حرام“ اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنایا کرتے تھے۔“ میں شاعر بدنام..... میں چلا..... محفل سے ناکام..... میں چلا.....“ تو بس یار..... یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں، محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا ”اور یہ پھولوں جیسی لڑکی سنبل، یہ اس شاعر ناکام کی کیا لگتی ہے؟“ اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”بگلی ہے، مزاروں کے درگھنگھٹائی رہتی ہے۔ اب دیکھو، تمہیں پکڑ لائی ہے اور یہ تم ہی تھے کد گئے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا۔“ اسے میں باہر محن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے نا ساز کو لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات لیے کھڑی تھی۔ ”آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ اسے بچا لیں پڑی زاد صاحب، آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں.....“ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہونا نا ساز کو.....“ سنبل کی آنکھیں جھلک پڑیں ”اسے کینسر ہے، اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اس کا کینسر.....“ میرے پیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

(جاری ہے)

بائیں قدم تو جوان نسل کے پسندیدہ، منکب کے معروف و منفرد راما رائنز، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سُنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رقیوں، بد بیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتہ وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سُنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguroup.com.pk

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے باہر نکلی، تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چلو میرے ساتھ، اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کو نے میں بھی، جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمہ داری ہے۔ اٹھو، جلدی کرو۔“ ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ ”بہت دیر ہو چکی ہے پری زاد..... اب مجھے یہیں رہنے دو۔ یہ کمرہ، یہ تنہائی اب یہی میری سنگت ہے، اور پھر یہاں وہ لپگی بھی تو ہے ناں..... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو۔“ میں نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا، ساری زندگی دوسروں کو بھینے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو، ایسا کیوں کر رہے ہو میرے پیار.....؟“ ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”زندگی خود مجھ سے دامن چھڑا کر ان کی فکر میں ہے پیارے، میں ہی ڈھیٹوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں، اب اگر مرنے بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔ میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے ناں پری زاد.....“ میں نے واپس پلٹنے سے پہلے بھر کے لیے اسے دیکھا۔ ”کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام، کل تیار رہنا۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔“ ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ ”تفتیش بجا ہے، کہ مجھے شق ہوا ہے..... نئے میں لکھوان سے ملاقات مسلسل“

اگلے روز یعنی کی گیلری میں بھی میرا دھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ یعنی نے حتی طور پر چند زاویے درست کیے اور مجھے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ”بس جناب، ہو گیا مکمل“ اس کی آواز سے جوش چمک رہا تھا۔ ”بتائیں ناں پری زاد۔ کیا بنا ہے آپ کا اسٹیچر.....؟“ میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر یعنی کے بنائے مجھے پر پڑی تو آنکھیں گھلی کی گھلی رہ گئیں۔ میں نے اختیار اٹھ کر مجھے کے قریب آگیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، اتنا بے داغ، خوب صورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ، ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ یعنی میری حالت سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جارہی تھی ”میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پری زاد..... بتائیں ناں، کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے، آپ چُپ کیوں ہیں، بولتے کیوں نہیں، کیا میں نے بہت بُرا بنایا ہے۔ کچھ تو بولیں، پلیز.....“ وہ پریشان سی ہو گئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اجنبی تھی ”نہیں، تم نے دنیا کا سب سے خوب صورت چہرہ تراشا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ پیاری لڑکی میں تو وہ ہوں، جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوا میں گھبرا کر تھم جاتی ہیں، سورج مدہم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی تپتی کر میں برسا نے لگتی ہے۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آگئی ”ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، یہ میرے سن کی تصویر مٹی کے قالب میں ڈھالتی ہیں، سچ بتائیں، اس چہرے کے خدو خال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا.....؟“ میری آواز بھڑک اُٹی۔ ”ہاں بلاشبہ، خدو خال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہ ہیں، مگر جو ٹور، حُسن و وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاری گری نے اس مجھے میں منتقل کر دی ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی، کوئی حُسن نہیں۔“ وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کول سن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ وہ دنیا بڑی ظاہر پرست ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا اُداس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ یعنی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اس کے گھر سے واپسی پر اسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے گھر لے آیا۔ ناساز نے یعنی کو میرے ساتھ دیکھا، تو حسبِ عادت مصرع اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ”سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا ”سو، اس کے شہر میں کچھ دن بھر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اسے گھور کر دیکھا ”باز آ جاؤ، یعنی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے۔ دنیا کی کوئی بھی بیماری لاعلاج نہیں ہوتی۔ کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے۔“ یعنی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے پنے نغمے یعنی کو سنائے۔ کچھ دیر بعد سنبل بھی آگئی اور حسبِ معمول دو لڑکیوں کے اکٹھے ہوتے ہی باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسی گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ کہتے ہیں، دو لڑکیاں جب پہلی بار ملتی ہیں تو عموماً ڈھائی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے ان کا پہلا سوال ہوتا ہے ”ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟“ وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھی شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ ناساز سرک کر میرے قریب آگیا ”تم تو بڑے ٹچے رستم نکلے پری زاد پیارے..... ایسی پری ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دے۔ اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی دیران ہے۔“ میں نے ڈکھ سے باہر بیٹھی یعنی کی طرف دیکھا۔ ”وہ دیکھ نہیں سکتی، اس لیے میرے ساتھ ہے، ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تنہیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا۔ کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم، اُن جان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بننا رہا ہوں۔“ ناساز میری بات سن کر خاموش سا ہو گیا ”میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے زخموں پر نمک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے، لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبائیں سکتے تو، پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو۔ آخر کب تک خود کو اسے اُن دیکھے عذاب کی بجلی میں جھونکے رکھو گے؟“ میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں، صرف جیب میں دمڑی ہونی چاہیے، جو ماشاء اللہ اب تمہارے پاس بہت ہے۔ کہیں بھی بیرون ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروالو۔ آج کل تو ساری دنیا کو چہرہ بدلنے کا خطبہ سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروا لیتے ہیں۔ تو پھر اگر تم بھی اپنی جون بدل لو گے، تو بھلا کون سی قیامت آ جائے گی۔ اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔

رخصت ہوتے وقت ناساز نے یعنی سے کہا ”سنو لڑکی، آج میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں، جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی۔“ یعنی کی پلکیں نم ہو گئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا دھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں الجھا رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن عذابوں کا سامنا رہا ہے، وہ سب الجھنیں، کرب اور عذاب ایک ہی جھجکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر غر بھری شناخت

بدلتا تو کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس پدی زاد کو جانتے ہیں، وہ ایک نئے اور اچلے چلے والے پدی زاد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری رات نہ جانے ایسے کتنے بے سرو پا خیالات میرے خالی دماغ میں کھٹکھٹاتے رہے۔

جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمالی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹے ہی شکوہ کیا۔ ”یہ کیا سر جی! آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی، اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی۔“ کمالی کے ہاتھ میں صبح کا اخبار کچھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ تو یہ خبر پچھ گچی، یہ اخبار والے جانے اتنی جلدی کیسے اُڑتی چڑیا کے پدگن لیتے ہیں۔ ابھی تو صرف منصوبہ ہی بنا تھا۔“ کمالی نے جوش میں اندرونی صفحہ کھولا ”شہ پارہ بیگم کا پورا انٹرویو پچھپا ہے سر! ساری فلم انڈسٹری ہلا کر رکھ دی ہے آپ نے، کبھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا۔ آہ، مگر اب تو فلم دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔“ میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمالی اپنی ذہن میں بو لے گیا۔ ”اس دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا سر کہ شادی کے اتنے سال بعد بچہں اور گھر بار کے مسائل کے جھوم میں ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے، تو بات صرف محبت کی نہیں ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور خواہشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غم دوراں کی آندھی میں۔ اب یہی فلم ایکسٹرنل والی خواہش ہی لے لیں میری۔ کاش! میں شادی کے چکر میں اس آرزو کا گلا نہ گھونٹتا۔“ کمالی باقاعدہ غم گین ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جانتے ہو کمالی، دنیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے، وہ، جو اپنے ماضی کے کیسے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حال میں خود کو کوسے۔ تم نے اُس وقت وہی فیصلہ کیا، جو تہارے دل نے بہتر جانا۔ تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی۔ اگر اُس وقت تم فلم انڈسٹری جو ان کر لیتے تو شاید آج ایک نام ور آرٹسٹ کہلاتے، مگر یقین کرو، اپنی محبت کھو دینے کی کک تمہیں آج زیادہ غم گین رکھتی۔ جسے تم نے پالیا، بس وہی تمہارا نصیب ہے، باقی سب سراپ ہے۔“ کمالی نے اثبات میں سر ہلایا ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، مگر یہ پاپا ہوا نصیب اپنی کشش کیوں کھو دیتا ہے۔ لا حاصل ہی ہمیشہ پُرشش کیوں رہتا ہے؟“ میں نے لمبی سانس بھری ”شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناٹھگرا ہے۔ اور رہی بات محبت کی، تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفتہ رفتہ ہماری محبت، شفقت میں بدل جاتی ہے۔ محبت، محبت، نہیں رہتی، ایک گہری شفقت بن جاتی ہے۔“ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”شفقت..... میں سمجھا نہیں سر۔“ ”ہاں کمالی، شفقت، ہماری محبت کہیں کھوتی نہیں ہے۔ بس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہم باقی ساری زندگی اس شفقت ہی کو محبت سمجھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جاؤ کمالی، اپنی بیوی بچہں کو اپنا پورا وقت دیا کرو۔ کیوں کہ کبھی کبھی شفقت کا قرض محبتوں کے اُدھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔“ کمالی چپ چاپ دفتر سے نکل گیا۔

اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کھلسا کر ان کے ادارے کی شرط پر پورا اُترنے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موند لیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے ان باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی۔ یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج کر رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے لڑکے، اگر تمہاری یہی خصلت ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا ادارہ بہر حال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری ٹیٹ لکھ کر بھیج کر رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے منکک کے کسی مستند طبی ادارے سے یہ ابتدائی ٹیٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی، تو میں تمہیں اطلاع کروں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی الٹی صمدی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص، ڈاکٹر پال جوز۔“ میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہو چکی تھی۔ اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا بھلکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھونڈتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، فکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لمبھی اور ڈائریکٹر پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لمبھی نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دل چسپی نہیں لے رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ہم بہت جلد گانوں کی فلم بندی کے لیے کینیڈا روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گانوں کی فلم بندی کا بتا کر یونٹ کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا، جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت، میں چاہتے ہوئے بھی سر جری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور زد بین ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں پڑانے میں ذرہ برابر بھی تاثر نہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سر جری کروا لوں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک ڈور دراز کے بڑے اسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے طبی تجربے بھی کروا لیے تھے اور اب مجھے ان کی رپورٹس آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد یعنی کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں ہفتے میں ایک آدھ چکر اس کے گھر کا ضرور لگا لیتا تھا۔ کچھ گلیاں اور کوچے اپنی سمت بلانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ مونی سی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دل کے کواڑ سدا کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی مخلص اور مہربان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آپ جلدی سے شوکت خانم اسپتال پہنچیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔“ میں سب چھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ اسپتال کی طرف بھاگا۔ راہ داری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سروس کی طرح بیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر خشک سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بے مشکل مسکرایا۔ رستہ روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی۔ جانے ٹوٹے دل میں کیا ارمان ہے باقی۔ جانے بھی دے ال۔۔۔۔۔۔ سب کو میرا سلام۔۔۔۔۔۔ میں چلا، میں شاعر بدنام۔۔۔۔۔۔ میں چلا، میں چلا، محفل سے ناکام۔۔۔۔۔۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کہیں نہیں جا رہے ہو تم، سنا تم نے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“ اس کے سر ہانے کھڑی سنبل اور استاد بٹنے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بے مشکل آنکھیں کھول کر بولا ”دیکھا ہے زیادہ پیارے، یہ تو واقعی اُسی فلم کا سین بن گیا یا ر۔ لگتا ہے، جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے قلمدا کی تھی، مگر یار، میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے۔“ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا ”پپ ہو جاؤ، خود کو خطرہ مت کرو۔“ ”میں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری تھکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔“ ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا ”یہ کہانی بھی اُدھوری رہ گئی ہے زیادہ۔“ میرے جانے کے بعد ان باپ بیٹی کا پورا خیال رکھنا۔ اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائل میں میرا نام۔۔۔۔۔۔“ ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ چھو تھپتھپایا ”ناساز۔۔۔۔۔۔ پپ کیوں ہو گئے، بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں جاسکتے، بولو، بے وفا، دغا باز۔۔۔۔۔۔ کچھ تو بولو۔ بات کرو۔۔۔۔۔۔“ میری چیخیں سارے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بٹنے نے اسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے دُور کر دیا۔ میں چیخا چلا تارہ گیا۔ استاد بٹنے نے دبوچ کر مجھے گلے لگا لیا ”پپ کر جاؤ۔۔۔۔۔۔ ناساز اب کبھی نہیں بولے گا، وہ مر چکا ہے۔“

(جاری ہے)

بائیں شہنشاہ عالمگیر کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد راما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے آن گشت بد صورت روقوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر میروڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا، کسی کام میں من نہیں لگ رہا تھا میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف درد ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ سنکھ کی سیاسی شایداں کی باری آنے سے پہلے ہی شک ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایسی ہی ایک آداس شام، جب میں اپنے اندر صرے کرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر سے متعلق ہی سوچ رہا تھا، تو مینی آ گئی۔ ”کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو، ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کا جانا تھا، سو وہ چلا گیا۔ مگر ہم سب ابھی یہیں ہیں، ہماری خاطر ہی سہی، خود کو سنبھالیں۔“ میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ”اگر سب کا جانا طے ہی ہے، تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں۔“ یعنی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”باریاں اس لیے لگا دی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد ان کے اپنوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ سنہل اور استاد بننے خان کی ذمہ داری آپ پر ڈال گئے ہیں۔ کیا انہیں کوئی نئی تہا چھوڑ دیں گے پری زاؤ؟“ کیا ستم ہے کہ ہوا کے سب رستے، سب درزیں بند کر دینے کے بعد، زندگی ہمیں سانس لینے پر بھی مجبور کرتی ہے، کیوں کہ جینا تو ہے۔ ہاں، جینا تو پڑے گا، مزید ستم سننے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے۔ اگلے ایک ہفتے میں شہر کی ایک نئی ہستی میں استاد بننے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا، جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمالی نے اس سارے معاملے میں بہت بھرتی دکھائی اور دو ہفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا، مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گزر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پائی تھی، مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ بھڑاؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئینہ دیکھا، تو مجھے ایک دم ہی ڈاکٹر پال کی یاد آ گئی۔ میں نے اپنی ای میل کھولی تو ڈاکٹر پال کی تین میلو آچکی تھیں، جس میں اس نے میرے کرواتے گئے طبی تجویزوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اُسے ای میل کر دی۔ کمالی اس عرصے میں فلم پونٹ سے مسلسل رابطے میں تھا، اور مجھے وقتاً فوقتاً پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل یعنی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے ڈھائی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی جھڑوں درکار ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری عمر بھری ہم سفر بنا قبول کرے گی، کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے، کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں ختم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے.....؟ میں نے راستے میں گاڑی رکو کر پھول والے سے عینی کے لیے ایک گل دستہ بنوانے کا سوچا، لیکن پھر بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا، دنیا کے سارے پھول پگھڑیوں سے جو کر رہے ہیں، مگر جب خود کسی پگھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چنناؤ کیسے کرے۔ ہر پھول اس کے سامنے بیچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پیچھا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ دم مقابل جب ”گلاب تر“ ہو تو پھولوں کو بھی ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔

میں بہت دیر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا رہ کر اپنی الجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے خُسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ ابھری اور میں سنہل کر کھڑا ہو گیا۔ گل دستے پر میری گرفت سخت ہو گئی اور پھر دروازہ کھلا تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نو جوان میرے لیے قطعی انہی تھا۔ ”جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کھلتی رنگت، بکھرے بکھرے سے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ خوب، با اعتماد اور مغرور سا دل لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستہ والا ہاتھ میکانیکی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا ”تم کون ہو.....؟“ وہ لڑکا ہنس پڑا۔ ”لو، وہ بھی ہم سے پوچھتے ہیں.....؟ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نازل ہوا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟“ میں نے اپنے ذولتے کو سنبھالا۔ ”میں عینی کا دوست ہوں، پری زاؤ نام ہے میرا۔“ عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا ”اچھا..... تو آپ ہیں پری زاؤ..... گریٹ..... سر کھالیا ہے، اس پاگل لڑکی نے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے بچ بٹاؤں، تو میں آپ سے جیلس ہو رہا تھا۔“ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا وہ زور سے ہنس پڑا۔ بُر امت مایے گا، مذاق کی عادت ہے میری۔ اندر آئیں ناں۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی اندر ہی ہیں۔“ میں چپ چاپ اس کھنڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں پکڑا گل دستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آ گئی، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ”ارے آپ آگئے پری زاؤ..... دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا کزن عدنان، بچا نکم، اس نالائق کو کچھ کر ذرا بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا۔ حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی۔“ عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا ”تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں۔ تمہاری گلی کا ایک آوارہ، جو گھٹنوں دو پہر میں تمہارا کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں لٹی.....“ وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اُسی لمحے میں نے خود کو وہاں سے حد انہی سانسوں کی، بل تک بلی درو دیوار مجھے کتنے مانوس، کتنے مہربان سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک اجنبی کے آجانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تن دی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں جی ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنسنے رہے۔ عینی نے عدنان کو ٹوکا ”بس بس..... رہنے دو یہ تابع واری کی باتیں، خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دو چہروں میں کس کے لیے دھوپ چانا کرتے تھے۔ کیا تھا تم اس عینکی کا۔ ہاں، نگہت اور وہ دوسری جھینی، مدوش اور وہ تیسری.....“ عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔ ”اوہ، بس بھی کرو، وہ بچپنا تھا میرا..... اور ایسی دو چار معاشقے نما دوستیاں تو سبھی کرتے ہیں لڑکپن میں۔ کیوں پری زاؤ صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ خواب تو پالے ہوں گے، اس عمر میں آپ نے بھی.....“ میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! خواب پالنے کے لیے نیند کے کچھ خوب صورت

”پالنے“ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک نیند کا وہ ”پالنا“ ہی دھوئیں رہا ہوں۔ نیند آجائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں۔“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا ”واہ، میری بیماری کزن یونی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے“۔ میں اٹھ کھڑا ہوا ”اب میں اجازت چاہوں گا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دونوں بوکھلا سے گئے۔ یعنی جلدی سے بولی ”ارے، آپ کہاں چل دیئے، اُمی نے کھانا لگا دیا ہے اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں.....؟“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی ”ارے ہاں، یاد آیا۔ فلم کا یونٹ کینیڈا جا رہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں۔“ یعنی خوشی سے چٹائی ”واہ زبردست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمن جاں..... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب۔“ میں نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا ”کیوں؟“ عدنان نے جلدی سے دھل دیا۔ ”پُر ی زاد صاحب! آپ ہی سمجھائیں اس لڑکی کو۔“ میں نے امریکا کے ایک بڑے ملٹی ادارے سے عینی کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے، وہ لوگ تو بے فی صد پر امید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قریبی بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل باہر کے ملکوں میں عموماً سزائے موت کے قیدی یا بستر مرگ پر پڑے مریض اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے عینی کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قریب ملنے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں عینی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے،“ عینی نے حتیٰ لچھے میں کہا۔ ”خواب دیکھنا چھوڑ دو مائی ڈیز کزن ڈاکٹر عدنان! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہیے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ الگ۔ کہاں سے آئیں گے اتنے روپے.....؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے اپنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سو نومور بحث او کے.....“ وہ دونوں بیچوں کی طرح بحث کرتے رہے۔ میں نے عینی سے اجازت چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے راستے ان دونوں کی نوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو عینی سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلنے لگی تھی۔ مگر خود عینی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آرہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں تھمتے لگتی ہے۔ کانوں جیسی ٹمکن اور کسک ہمارے وجود کو کیوں تھپتی کرنے لگتی ہے؟ کیا اسی اور قاتل کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر کروش بدلتا رہا۔ یہ رقاقت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک جاتا۔ مگر عینی تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں اُسے کیا بتاتا، مجھے تو خود پتا نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ ”مس قراۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں“ تو ایک لمحے میں ساری بے چینیوں، ساری پتا بتائیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں تیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سنتے ہی وہ ناراضی سے بولی ”کہاں غائب ہیں آپ، تین دن سے، نہ کوئی فون نہ کوئی خبر خبر۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان لیں اچھی طرح۔“ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟“ میں نے گہری نظروں سے اس خُص ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالنگ رہی تھی۔ ”چلو کچھ جرمانہ طے کر دو، میری غیر حاضری کا۔“ آخر کار، بات یوں ختم ہوئی کہ مجھے اُن دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور اوپن ائر ریسٹوران میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت عینی کے کمرے سے نکلنے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ عینی کے لیے میچنگ لینز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر عینی جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے دبے لفظوں میں مجھ سے رات کو عینی کو منانے کی درخواست کی۔ اپنا آبائی گھر بچ کر عینی کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی ہزار خدشے، ہزار وسوسے، مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری محبت ریت کے ذروں کی طرح میری مُٹھی سے نکلنے جا رہی ہے۔ رات کو ریسٹوران کی ٹیبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ، جیسے دو ہنسوں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تنیوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتا، تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ عینی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ ”آپ اتنے چپ چاپ سے کیوں ہیں پُر ی زاد..... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم ضم سے ہیں۔“ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے۔“ عینی نے لمبی آہ بھری ”اچھا..... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔“ میں نے دیر سے کہا۔ ”ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر۔ آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے۔“ عینی ہنس دی۔ ”ہاں، ٹھیک کہا آپ نے، پتا ہے پُر ی زاد، میں نے سات سال کی عُمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا، جانے اب کیسا دیکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اُتار پھینکتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اُسے خالہ سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں پُر ی زاد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری بیٹائی واپس آئے،

میں سب سے پہلے عدنان ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں پُر ی زاد..... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں ہیرے اور کوئلے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ ”جی پُر ی زاد صاحب! کچھ آیا اس ہلکی کی عقل میں یا نہیں۔ اسے سمجھائیں کہ اپنوں کے خلوص کو یوں ٹھکرایا نہیں کرتے۔“ عینی نے احتجاج کیا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اُس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بیٹائی سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ بس، ہو گیا فیصلہ۔ تم وہ گھر کبھی نہیں بچو گے۔ اور اگر کبھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا۔“ عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، میں نے دھل انداز کی ”تم دونوں خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہو۔ عینی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ عینی کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔“ ”نہیں پُر ی زاد! ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں نے زندگی بھر ایک یہی خودداری کا بھرم ہی تو کیا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عُمر بھری یہ یہ واحد کمائی بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی بیٹائی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عُمر جھکی رہے۔ پلیز، آپ ایسا نہ کریں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو یوں ہی سہی، مگر پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ میں عُمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر میں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا، لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدنان کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کر لے گا، مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے۔“ عینی نے بے چینی سے پہلو بدلا ”لیکن.....“ ”کوئی اگر مگر، لیکن نہیں سنوں گا میں، بس طے ہو گیا۔ تم لوگ جانے کی تیاری کرو، آج کل ویسے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ ہی برس میں اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا۔“ عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ آپ واقعی کمال ہیں پُر ی زاد صاحب.....“

اس وقت تو یحییٰ خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل فون پر جھلکا ہے لگا ”پڑی زاد! میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔“ میں نے بات مذاق میں نالی۔ ”نہیں بے وقوف لڑکی! تمہیں نہیں پتا کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھائے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ لیتا، عدنان رقم چکا نہ کہ، تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے پڑی زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟“ وہ ہنس پڑی۔ ”آپ ہمیشہ گھائے کا سودے ہی کرتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دنیا دو بارہ دیکھوں، تو میری پہلی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں، قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے۔“ میں نے جلدی سے حامی بھری۔ ”ٹھیک ہے ضدی لڑکی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔“ میں نے یحییٰ کو تلمتی دے دی، مگر خود میرا چین و سکون ہمیشہ کے لیے ہوا ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر لان میں ٹھٹھا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد یعنی جب مجھے دیکھے گی، تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”سنو عدنان.....“ وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھمادیے۔ ”یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف یحییٰ کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈراما کیا تھا۔ یحییٰ کی آنکھیں واپس آ جائیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا راز یحییٰ کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پڑی زاد صاحب! میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پانی واپس کر دوں گا۔ یقین چاہیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی۔“ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی۔“ عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا۔ ”آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے ہفتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر یحییٰ کی آنکھوں کی نئی گھٹنے سے پہلے آپ کو بھی امریکا پہنچنا ہوگا، ورنہ وہ ضدی لڑکی آپریشن ہی نہیں کروائے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس نے آپریشن کے لیے ”ہاں“ بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے۔“ میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جھلکاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیئے تھے، جب وہ یحییٰ کا ذکر کرتا تھا۔ ”آپ جانتے ہیں پڑی زاد صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن یحییٰ پہلی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی، میں اسی دن اُسے شادی کے لیے پروپوز کر دوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔“ میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ”کیا..... میرا مطلب ہے کیا یعنی کبھی اس بات کی خبر ہے؟“ عدنان نے جیسے خوابوں کی ہستی سے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے۔ چلتا ہوں، بہت سے کام اُدھو رہے پڑے ہیں۔“ عدنان پلٹ کر چلا گیا۔

میرا سر بُری طرح پکرا رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمالی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں سر.....؟“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کمالی! میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔“ میں دروازے تک پہنچ کر کڑک گیا۔ کمالی ابھی تک گم سم سا کھڑا تھا۔ ”کمالی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟“ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں سر! خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا۔ مگر سنا ہے کہ محبت کی اصل روح تنہی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے۔“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمالی سے پوچھا۔ ”رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمالی؟“ ”رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ غصہ نہیں ہوتا۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جنگ نہیں۔“ کمالی مسکرا دیا۔ ”محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بھلا اور کیا ہوگی، اس دنیا میں سر..... اور آپ نے سنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔“ میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو لانا لگا نے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ ”کبیر خان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟“ کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاحب.....“

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”پنچن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رتوں، بد بیست آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا سی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@jangugroup.com.pk

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا ”آپ حکم کرو صاحب..... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے، آپ کے لیے“۔ میں اپنے خیالات سے چونکا ”ہاں..... فی الحال کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ خیال آ گیا تھا، تم جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھر والی راہ دیکھتی ہو گی تمہاری“۔ کبیر کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور الجھن زدہ سا وہاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یہ کبھی عجیب سی ایک جنگ چھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا ”پری زاد“ جنم لینے لگا تھا، جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سارا دن میرے اندر بولتا رہتا۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو! حق انسان، خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتظام خوب کیا ہے تم نے، اب تمہاری رقم سے عدنان عینی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑا دیکھے گی، تو فیصلہ کس کے حق میں ہو گا، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے، مگر صرف مان، عزت اور تعظیم۔ اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس تبسم کو میں اپنے مقدر کی پھوار سمجھا تھا، وہ تو اس کی عادت نکلا۔ چار دن اس نے مجھ سے ہنس کر بات کیا کر لی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا، میں تو اس کی محبت کا حق دار سمجھ بیٹھا تھا خود کو، احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا، اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے۔ میں وہ منافق تھا، جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اُس وقت تک روند تار ہوں، جب تک کہ زندگی کی آخری رمت بھی ختم نہ ہو جائے۔

اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ڈرائیور کو گاڑی اُس طرف موڑنے کو کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تنہائی ہمیں صرف لوگوں کے جھرمٹوں میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی، جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔ یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے، مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، مگر عموماً مسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور سا اٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لہنی اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شپا رہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لہنی کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینٹ سنہال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گزرنے کے بعد یہ یادیں بھی رُڈی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لہنی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی ”ارے پری زاد، تم.....؟ کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟“ ”نہیں، خود سے ٹھپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا۔“ میرا جواب سن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ ”کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو ہمیشہ؟ کب تک جلتے رہو گے۔ یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز، خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو۔“ میں دھیرے سے مسکرایا ”گویا منافقت کا درس دے رہی ہو۔“ ”نہیں، پری زاد نہیں۔ مگر یہ دوغلا پن ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمائی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جا رہے، کیا کوئی پریشانی ہے.....؟“ میں نے بات نالی ”نہیں، تم لوگ پہنچو، میں بعد میں آ جاؤں گا اور سنو، مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی۔ لیکن وعدہ کرو، پُھر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا۔“ وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ ”مت کیا کرو ایسی باتیں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اور اگر میرا بس چلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پری زاد.....“ میں نے شکوہ کیا۔ ”پھر وہی احسان کی بات؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا۔“ لہنی کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ”تم نہیں جانتے پری زاد! مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں اُن گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو غم بھر کچھ کے لگا تا رہتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے محسن کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتے اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے۔“ لہنی کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون خاموش کر دیا تھا۔ بے خیالی میں نظر پڑی تو کمائی اور عینی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب ٹماٹے ہے یہ سیل فون بھی، ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط ٹھیکے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ عینی بی بی کا درجنوں بار فون آچکا ہے۔ اس نے پنا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ”کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بناتے۔ چار پانچ دن بعد میری روائی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے۔ یاد رکھیں پری زاد، اگر آپ وقت پر نہ یار کہ نہ پہنچتے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی اور اسے دھمکی سمجھے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔ ”نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان۔ مجھ جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو۔ اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل۔“ عینی رو ہانسی ہو گئی۔ ”کیوں، کیا مجھے آپ کے لیے فکر کرنے اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود ہی سے روٹھا ہو تو اسے کسی دوسرے کو منانا کتنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اُس روز ہوا۔ تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلٹا نیاپری زاد مجھے دن بھر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ رقیب سے رقابت اور دشمن سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پری زاد، یعنی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو۔ کاش عینی کو کبھی بیٹائی ہی نہ مل پائے۔ پری زاد کے لیے تو اس کی کومل روح کی چاندنی ہی کافی ہے، غم بھرا آجالا کرنے کے لیے۔ اس کی بیٹائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرنے والا احق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس بھرار کی گونج سے، درد سے پھٹنے عر کو تھام لیا۔ اُسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا صاب..... سب خیر تو ہے؟“ اور شاید شیک وہی لمحہ تھا، جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔ ”کبیر خان..... ادھر تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو؟“ ”ہم اس کو قتل کر دیتا ہے صاب..... ہمارا علاقے میں محبت اور غیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے۔“ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھیج لی۔ ”کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان۔ اس کو بھی ختم کر دو“ کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ”تم صرف اس کا نام بولو صاب..... چوبیس گھنٹے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا۔“ میں نے ایک کانڈ کے رقعے پر عدنان کا نام اور پتا لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ ”یہ لڑکا آج کل زیادہ تر بیٹی بیٹی کی گھری پر رہتا ہے۔ دھیان رہے۔ یہ کام تب ہونا چاہیے جب وہ لڑکا تنہا ہو۔“ کبیر نے سر جھکا دیا۔ ”آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم سمجھ گیا۔“ کبیر کسی اچھے وقادار کی طرح زیادہ سوال جواب کے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر بنا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سیل پورے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ پل بھر میں سیکڑوں گھرا جڑ دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آنگن آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہتا تھا، میں نے کہ ایسا ہو، مگر ایسا ہو رہا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزہ کر کر کر دیتا ہے۔ میں تو وہ بے ہنر تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح نبھایا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال ظرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرون ملک روانگی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے، جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا، جیسے عدنان کو راستے سے ہٹانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ یعنی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں الجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ جرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ کمائی بھی دفتر میں عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ تقریب کا مہمان خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا، مگر جھٹ فیتہ کانٹے والی قینچی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیتہ کتنا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے، جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی انگلیوں کا ہنر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک بنی غصی سی لڑکی ایک پختہ عر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ”کیسے ہیں پری زاد صاحب، کبھی غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے توشہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمائی نے جلدی سے تعارف کروایا۔ ”سریہ میڈم زارا ہیں۔ شہ پارہ کی ٹکڑ کی ہیروئن ہیں۔“ زارا نے انکساری سے عر جھکایا ”کہاں جی..... شہ پارہ کی ٹکڑ کی ہوتی تو آج میں بھی پری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر انہوں نے تو میں پوچھا تک نہیں۔“ کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان بھڑانے کے لیے کہا ”اگر میں نے کوئی دوسری فلم بنائی، تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور الجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا۔“ کمائی نے میرے بٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس خُسن بے پروا کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر ایک فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمائی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ ”سرا یہ زارا نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ”خاص“ نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی ڈنر وغیرہ کریں۔“ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے کمائی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ ”تم جاننے ہو کمائی! مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ خُسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر غل جائے تو بے یک وقت اس سے زیادہ گراں اور زراں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی۔“ کمائی مسکرایا ”یہ آپ ہی ہیں، جو اس جنس کو زراں سمجھ رہے ہیں عر، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امراء اسی زارا کے ساتھ لُچ یا ڈنر پر ذرا سا وقت گزارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب خُسن اپنی قیمت لگانے پر آجائے تو اس سے مہنگی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔“ میں نے عر جھکا ”وہ خُسن ہی کیا جو بک جائے۔“ ”ٹھیک کہتے ہیں عر آپ، مگر بات اگر سودے بازی کی ہو تو خُسن کے پاس دان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ خُسن ہی ہو جاتا ہے۔ شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں، زارا جیسی ادافروش کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے عر۔ کسی کے لیے دولت کے انبار، رڈی کانڈ کے ٹکڑوں جیسے ہیں، تو کسی کے لیے خُسن اور ادا اس رڈی کا نعم البدل۔“ اتنے میں دوسرے ہال سے اسپیکر پر تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی روم میں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اُس سے نظر ملی، تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔

جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ فکر نہ کریں صاب۔ آپ کا غلام موجود ہے یہیں۔ میں نے عینی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آکر کچھ کہنے کو نہیں کہے گی، کیوں کہ میری طبیعت اس وقت اجازت نہیں دے رہی، لہذا تقریب کے اناؤنسر نے سب سے پہلے میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود متعلقہ فن کے ماہرین کو ڈانس پر بلایا جاتا رہا اور وہ عینی کے فن کے بارے میں اپنی رائے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھایہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ”کن خیالوں میں گم ہیں پری زاد صاحب؟“ میں عدنان کی آواز سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ مجھے لگا، جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔ ”آپ جانتے ہیں پری زاد! عینی بہت خوش ہے، جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہتی ہے سارا دن کہ جب اس کی بیٹائی واپس آجائے گی، تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کا اسکول، محلہ، گلی، سڑکیں اور گھر دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ، جہاں سے اس کی کوئی یاد بجزی ہے، لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیے۔ میں نے بھی جیہ کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب عینی کی بصارت واپس آجائے گی، تو اس کے نصیب کے ہر اندھیرے کوروشی میں بدل دوں گا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہو گا پری زاد صاحب۔ اصل میں یہ آپ ہی ہیں، جو ہم دونوں کی زندگی میں ضیاء بن کر آئے ہیں۔“ میں گم غم سعادۂ ان کی باتیں سن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں عینی کا نام پکارا گیا، ہال میں تالیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈانس تک پہنچی تو سنا سا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے ٹر کبیر نے لگے۔ ”آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے نامور فن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مدح سرائی تو مجھ جیسی ہر نئی آرٹسٹ کا خواب ہوتی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے۔ ایک اعزاز ہے میرے

لیے کہ میرے محسن میرے آئیڈیل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اُس وقت مجھے اس سفید چھتری کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہو گی اور یہ سب بھی میرے اسی محسن کی بہ دولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنہوں نے قدم قدم میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے جینے کی راہ دکھائی، مگر اب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بھٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھردینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بہار دکھ رہے ہیں یہ سب اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ وہی جو میرے محسن، میرے آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے.....“ سارا ہال عینی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی، لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ و پکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پری زاد مجھ سے چٹچٹ کر کہہ رہا تھا ”تم ایک خود غرض انسان ہو پری زاد..... کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمہیں اتنا مان دیتی ہے، مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیا دار نکلے پری زاد..... خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا تن میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری زاد۔“ میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گہرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ٹھیک اُسی لمحے اس کی ملامت آواز سنائی دی۔ ”پری زاد..... کہاں تجھے بیٹھے ہیں آپ! میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے گہرا کر عینی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے عینی کو کامیاب نمائش پر مبارک باد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ ”ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونیورس ڈرا بیجیر میں جی گہرا رہا تھا۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہو نا!! آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا۔“ عینی ہنس پڑی، وہ بہت ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔ ”جناب! یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ پتا ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا لکی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں، خوش نصیبی کا ستارہ۔“ عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟“ عینی مسکرائی ”پتا نہیں، کہہ رہا تھا، مجھے کوئی سر پر اُتر دینا چاہتا ہے۔ شاید اسی سلسلے میں باہر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہو گا۔“ میرے ہوش اُڑ گئے۔ عدنان تمہا پر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے عینی کو وہیں رکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب لپکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہونا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا ”کبیر خان کہاں ہے؟“ ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تاکہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملایا میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور مٹا رہا تھا۔ ”فون اٹھاؤ کبیر خان، ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کبیر..... خدا کے لیے فون اٹھاؤ.....“ میں نے خود کھائی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا۔ میری آواز کانپ گئی۔ ”تم کہاں ہو کبیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ۔“ دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ ”ہم شکار کے پیچھے آیا ہے صاب، تم فکر مت کرو، وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانے پر ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا ”نہیں، کبیر خان! ایسی غلطی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آ جاؤ۔“ دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی۔ ”بہت شور ہے صاب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے..... وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانے پر ہے۔ بس ایک منٹ اور.....“ کبیر کی آواز کٹ گئی..... میں اتنی زور سے چلا یا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔ ”تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان! یہ میرا حکم.....“ میری آواز درمیان ہی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زا“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز ٹیڑھی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مست ہمو لیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں سر پکڑ کر ہیں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لٹھوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا، جیسے قریب پڑے میرے سِل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آرہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا، دوسری طرف وہی تھا ”کیا ہوا صاب.....“ اس طرف بہت شور تھا، ابھی یولو.....“ میں نے جلا کر کبیر سے پوچھا ”کیا تم نے اسے مار دیا کبیر.....؟“ ”نہیں صاب.....“ ادھر سگنل پر وہ بالکل نشانے پر تھا، مگر چوک پر کوئی حادثہ ہو گیا، اس لیے رش جمع ہو گیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے، ایک سنان سڑک پر.....“ میری آواز بیٹھ گئی ”نہیں کبیر خان، نہیں! تم واپس آ جاؤ“۔ کبیر نے احتجاج کیا ”مگر صاب.....!!“ میں نے غصے سے چیخ کر کہا ”یہ میرا حکم ہے، فوراً واپس آؤ“ ”ٹھیک ہے صاب“۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، جیسے میلوں ڈور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچتا تھا میرے پاس۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں تجوروں میں بھری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت چلا کر رکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائیداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اسی پڑی زادی کی طرح تہی دست اور خالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی ویران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے سُن کی یہی سُن کی حویلی ہی لکھی تھی، لیکن اب میں اپنے اس دشمن دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت سُن مانیان لڑ چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آکر، مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آچکا تھا اور مجھ جیسے دل جملے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں، تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف انارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کر کے سب کے حصے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی۔ ”محترم ڈاکٹر پال! میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کیونکہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست لگتی ہے کہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، تقدیریں نہیں۔“ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرے بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس، میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصہ براہِ راست آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم اُن لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں، ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا شاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کر دے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیونکہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دوں گا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہم دردی کی وہ لہر پیدا ہو، جو اس سے میرا مقتدر ہے، اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جھیل لیں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا..... دعا گو، پری زا.....“

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کمائی سمیت چند دیگر کمینٹز اور وفادار عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتے داروں اور عملے سمیت کبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ جب کمائی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا ”مگر سر! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سر، یہ پاور آف انارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اشاف سے یہ سب کچھ اکیلے نہیں سنبھالے گا سر!“ میں نے اسے تسلی دی ”فکر مت کرو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جا رہا..... بس اچانک کچھ ضروری مسائل پیش آ گئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے“۔ کمائی کی چٹکیں جھجک گئیں ”میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم نبھائوں گا سر، مگر یہ تو بتادیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟“ ”فی الحال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمائی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں۔ اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خان کا خاص خیال رکھنا، ایسے وفادار بہت نایاب ہوتے ہیں“۔ کمائی افسردہ سا، دل میں بہت سی باتیں لیے لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آ گیا۔ وہ کچھ کچھ پُپ سا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے ہے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟“ کبیر نے جلدی سے کالوں کو ہاتھ لگایا۔ ”نہیں صاب..... ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر، آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا“۔ میں نے ایک گہری سانس لی ”تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان، مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنادیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مار دیا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان.....“ کبیر سر جھکائے واپس چلا گیا۔

اگلے دو دن بھی پُر لگا کر اڑ گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکا روانگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔ ”میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار ہفتے میں سارے شہت ہو جائیں گے، اور پھر آپ ریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس

گھر واپس لوٹا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیکس پر دستخط کیے اور کمالی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل میں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ یعنی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سُن سے ہو گئے تھے۔ میں چل بھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا، مگر زندہ نہیں تھا۔ پتا نہیں صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ جیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سوا ہے۔ ڈرائیور کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے ہنسنا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور درجہ بندی کے اہتمام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا، مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کر چھوڑتی ہیں۔ ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی جائے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اترتے رہے، مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جھٹکن پر آ کر کھڑی ہو گئی اور کبھی مسافر اتر گئے۔ پتا چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن یہی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش! یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی، آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر ٹرین میں آ بیٹھا تھا کہ میرے بقیہ تمام عمر کا سفر اس ٹرین میں کٹ جائے گا۔ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آ کر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی، تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بچے لکڑی کے ایک بُرے سے شیخ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ناساز ٹھیک ہی کہتا تھا، منزل میں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ، جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے؟ یہاں پر موجود کبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصد سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی، شیخ، بوڑھے، عورتیں اور مرد، جمیٹر، جھومر اور بھانت بھانت کی بولیاں، غلٹ، زوردار اور راستوں کی فکر۔ سبھی کسی نہ کسی دھن میں گن تھے، مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان اچکا ہوگا۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد میرے واپس نہ لوٹنے پر کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ڈرائیور سے رابطہ کیا ہوگا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہوگا اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہوگا، تو گھر میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ کمالی کو تو میرے جانے کا قہور اُبت بہت علم تھا، مگر کبیر تک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہوگا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھوتا جتا تھا تک بھی نہ آ پہنچے۔ میں گھبرا کر لڑکھڑایا۔ گھر سے نکلنے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے نوے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح منہ اندھیرے اس گاؤں میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حماقتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی چیز ہو گئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کھودینے کا بہانہ بنالیا۔ جہاں گاڑی رُک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر یا بستی کا گاؤں کو نظر نہ دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہتا چاہتا تھا۔ میری شیوہ ہوتے بڑھتے داڑھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے، مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس نہ تھا تو میں اتر کر کسی پلیٹ فارم پر لگے ٹکٹے سے پیاس بجھا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھا لیتا، مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھنٹہ پانی اور چار ٹکٹوں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو غمر بھرنے جانے کیسے کیسے عذاب اور جوہم میں ڈالے رکھتے ہیں، جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا، جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گناتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب سے ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے، تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکنے آئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جینیں دیکھ ڈالیں، مگر کچھ بھی نہ بچا تھا، میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا، ڈور ایک تانگلے والا درخت کے سائے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں جاؤ گے بادشاہو..... اس علاقے کے تو نہیں لگتے۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے ”جہاں تک یہ سکنے لے جاسکتے ہیں، لے چلو۔ اس بستی سے پُرے، کسی ویرانے میں.....“ تانگلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”بستی سے پُرے تو قبرستان ہے..... اوہ اچھا، اب سمجھا، کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔“ آؤ بیٹھ جاؤ، میں پہنچا دیتا ہوں۔“ میں پُپ چاپ تانگلے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگلے والے نے قصبے کے باہری سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چار دیواری کے باہر تانگا روک دیا۔ ”واپس جاؤ گے، میں یہیں انتظار کروں کیا؟“ میں خالی ذہن لیے نیچے اتر آیا۔ ”نہیں تم جاؤ، میں دیر تک یہاں رکوں گا۔“ تانگلے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال اُبھرے، مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کر تانگا موڑ لیا اور کچھ ہی دیر میں ویران سرک کے آس پاس بکھرے کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے لکڑی والے بڑے گیٹ کو دیکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ دُور دور تک نئی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سُن وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگر کتیوں کے چلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے، مگر جھانے ہوئے خشک

پھولوں کی پٹیاں جا بجا کھری تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اسنے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں اسے گلابوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک عجیب سی خاموشی چار سو پچھلی ہوئی تھی۔ انسان کی عمر بھر کی فریاد اور چیخ پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت قریب ایک کرخت سی آواز ابھری۔ ”کون ہے بھئی ٹو..... اور یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا بڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کمر پر ہاتھ رکھے تاہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ”میں..... وہ..... دراصل.....“ اس نے کڑے تیوروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟“ ”نہیں نہیں، میں تو بس.....“ اس نے مجھے دوبارہ سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ”اچھا..... میں سمجھا، ڈاکڑی کی پڑھائی والوں کے لیے پُرانی قبروں سے بڈیاں پُرنے آئے ہوں..... پرکان کھول کر سن لے، فقیر! نام ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے۔ خبردار، جو یہاں سے ایک بڈی بھی ادھر ادھر کی..... ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی بڈیاں تجھے بیچ دوں گا۔“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں، میں یہاں مُردوں کی بڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کمر بٹکانے کے لیے رک گیا۔“ فقیر نے منگھوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کہیں ٹو، اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلائے کا ساتھی تو نہیں ہے، بیچتا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟“ مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیر کے کوچھاڑ دیا۔ ”تمہیں ایک باری کی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلائے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا اتہاری قبروں کی اس جا گیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا، شاید یہاں کچھ شکون مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے بیوپاری، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ پیچھے سے فقیر کی ڈھبلی سی آواز سنائی دی۔ ”ذرا رُک تو سہی.....“ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ ”معاف کر دے، دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرارت ہے۔ نام کیا ہے تیرا، اس علاقے کا تو نہیں لگتا۔“ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوچا تو میں نے اپنے پُرانے ڈرائیور کا نام بتا دیا۔ ”اکبر نام ہے میرا..... میں یہاں کانٹیں ہوں، بلکہ میں کہیں کانٹیں ہوں۔ نگہ ربا ہے نہ کوئی رشتے دار۔ بس، یونی بستی بستی بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی آ گیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں۔“ فقیر بالکل ہی نرم پڑ گیا۔ ”او نہیں نہیں، بس ایسے ہی فتنے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ تیرا جب تک جی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟“ میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں الٹ دیا۔ ”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ فقیر اُڑوڑ سے ہنس پڑا۔ ”اوئے بھلے! پیسے کس نے مانگے ہیں تجھ سے، چل آ جا، میری کوٹھری میں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مُردہ دفنایا تھا، اس کے گھر والے بیٹھے چاولوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں۔“ میں نے چپ چاپ فقیر کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کنیا میں ایک جھلا گسی چار پائی کو، نے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب گینتی، پیلچہ، کدال، رتی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیر نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیر کے کنیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیر سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کہاں جائے گا.....؟“ ”پتا نہیں، جہاں یہ رستہ لے جائے۔“ فقیر نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”ٹو یہیں کیوں نہیں رہ جاتا، تھیرا کھانا بھی ہو جائے گا اور میرا ہاتھ بٹانے والا بھی مجھے مل جائے گا۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مگر میں یہاں کیا کروں گا.....؟“ وہ زور سے ہنسا۔ ”میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا.....؟؟“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھٹاپے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رشتوں، بدینیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہاتھ ہی پر اتنا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا.....!! میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی۔“ فقیرازور سے ہنسا۔ ”جھوٹ بولتا ہے تو! ہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ فکر نہ کر، میں تجھے سب سکھا دوں گا، محنت سے جی تو نہیں چڑائے گا؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”اب میرے پاس چڑانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں۔“ فقیرے نے سُنی اُن سُنی کر دی۔ ”ٹھیک ہے پھر آجا اور ہاں، تُو نے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے چڑا کر لایا ہے یا پھر لنڈے بازار کا مال ہے، گور کن ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا، میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کر لے، صبح بڑا کام کرنا ہے۔“ ہم دونوں اندر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کو نہ میں پڑے ایک ٹرنک سے ایک بستر نما گدیا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ”ہیں ایک طرف اپنا بستر ڈال لے اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں، تیری آنکھ لگے تو بھلے سو جانا۔“ فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص برائڈ کی بیڑی لٹولی اور اپنی چارپائی کے نیچے کے نیچے سے ایک پڑا نکالی اور کاغذ میں لپی بہت سی بھورے رنگ کی راڈ نما تیلیوں میں سے ایک چُن کر اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر گزرنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کام یاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تبا کو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگالی۔ جھونپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ”کبھی چرس پی ہے اکبرے.....؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ”اچھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔“ پر میرا اس کے ہنا گزارا نہیں، قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں، سچ بتاؤں تو نوجوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے ہڈاڑ لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی۔“ فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سنتا رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سننے والا ملتا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا، میرا دھیان بٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر رنجھے کنی آسیب اور عفریت مجھے سالم نکلنے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کر دی ہو گی۔ وہاں نیویارک میں عینی کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہو گا۔ وہ مجھے عین وقت پر وہاں نہ پا کر کتنی مایوس ہوئی ہو گی، مگر یہ مایوسی یقیناً اُس مایوسی سے کہیں کم ہو گی، جو آنکھیں مٹنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا بُھا کر آپریشن پر راضی کر لیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خوب صورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے ویرانے سے گیدڑوں، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے سندھ پڑاڑاٹے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا، جسے نیند نہیں آرہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کٹیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کرئی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھٹنے بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعانہ پکڑا گئے۔ فقیرے نے ان کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”واہ بھئی اکبرے تُو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، پتا ہے دودن سے فارغ بیٹھا تھا میں۔ کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آجا شاہا ش، ہمیں گھٹنے بھر میں قبر تیار کرنی ہو گی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آئیں گے۔“ میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹی اٹھاتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پیسے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے دہائی کے ابتدائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری کی تھی، مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی، لیکن میں فقیرے کے ساتھ جُتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ جسم کی ٹوٹی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آ گیا، مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سوگوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹی ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لائق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا، مگر یہ رات والی ”خاص“ بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے گھنٹی ماری۔ ”ابھی دیکھنا کچھ ہی دیر میں ان رونے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سر کنٹا شروع ہو جائیں گے اور ایک دو کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیڑی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں گے۔“ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔ ”برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما..... سگریٹ ایسی بلا ہے، جھوٹ بھی بھلا دیتی ہے اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے، میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں ڈھٹ لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آ جاتا ہے، بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح۔“ میں نے فقیرے کے ہاتھ میں کپڑی بیڑی غور سے دیکھی۔ ”تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر اندر لپٹے رہتے ہو، میں نے سنا ہے اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔“ فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ ”تُو بھی ان جاہلوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے، میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں میں نے پہلا کش لگایا تھا، یقین کر آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس پینتیس سال کے جوان مردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تبا کو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اُن کے ساتھ آنے والے اس بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ چیتا تھا، نہ شراب، پھر اچانک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مر جانا چاہیے تھا۔“ میں لا جواب ہو گیا۔ ”تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پتے پر موت کا ڈراوا کیوں لکھ دیتے ہیں؟“ فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا تاکہ اس کی آواز قبر پر مٹی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے۔ ”مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے! یہ کیا بات ہوئی بھلا زہر ہے، تو پھر بیچتے کیوں ہیں گھلے بازار میں، بند کر دیں اس کی فروخت۔“ مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی پتیوں کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ”اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رونق رہے گی، روزانہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی اپنی دین داری میں الجھ کر یہاں سوئے شخص کو بھول جائیں گے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے.....!“

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیر ابا زرارے کو لونا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تازہ بیڑی کے کچھ بڈل تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ”یہ تیری مزدوری کا حصہ ہے، آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں۔“ میں نے وہ روپے دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ”یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ فقیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”تو بھی پورا ملنگ ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہنے دے۔“ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیر اجمو پنڈی کے باہر بیٹھا بیڑی چھو تک رہا تھا۔ ”یہ آوازیں کیسی ہیں؟“ فقیر نے حسب عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ”کوئی عامل کسی زنانی کو بے وقوف بنانے کے لیے مثر پڑھ رہا ہے۔“ میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جلی پیر نما شخص چند پہنے دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے فقیر.....؟“ ”یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سو کن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے، لہذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے ٹھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونڈی کو پکڑا کر واپس چل دیں گی۔“ میں نے حیرت سے فقیر کو دیکھا۔ ”مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈرامے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو؟“ ”اوئے اکبرے! اُتو واقعی بڑا بھولا ہے، جھٹے ایہ عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے، آدھے پیسے میری جیب میں آئیں گے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈاؤنی آوازیں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیر صاحب کی ”کرامت“ کا یقین کر لیں، یاد رکھ اکبرے، قبرستان میں جو بھی دھندا ہوتا ہے، اس کا آدھا حصہ قبرستان کے رکھوالے اور گور کن کو جاتا ہے۔“ میں حیرت سے منہ کھولے فقیر کے کیا باتیں سن رہا تھا۔ میں تو جیسے جیسے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکر و فریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مردوں کی بستی کے بکھیرے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اُس رات فقیر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نشے بازار اور جویوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں، تاکہ وہ رات بھر اپنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصہ ملنے کے بعد یہاں کا رُخ نہیں کرتا۔ جعلی عامل اور پیر اپنے نئے گراہیوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات ہی میں انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیر کے قبرستان بھیج دیتے ہیں کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے خلاف دبا یا گیا تعویذ یا سفلی عمل وہیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارہ جا بجا گھبراہٹا رہتا ہے، جہاں فقیر پہلے ہی سے کسی کالی مرغی کا سر، مزے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبا چکا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی غریبہ کی پونجی عامل پر اُٹا دیتا ہے اور فقیر کے کا حصہ اُسے مل جاتا ہے۔ ”میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیر کے کیا باتیں سنتا رہا۔“ ہر جا جہاں دیگر ”کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تنگ کرنے کے لیے فقیر کے حصے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا، مگر رات کاٹے نہیں کتنی تھی۔ اچانک ہی کسی پہرہ میری آنکھوں کے درمیان کھول کر میرے دل کے آگن میں آکر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چمچاتا، اپنی آنکھیں میچ لیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں، کدال اور پیچلے چلانے سے کھر دے چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور اجمو پنڈی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیر ابھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔ ”کیا بات ہے اکبرے! اُتو سوتا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جو ان جہاں بندہ ہے ٹو، کہیں کوئی عشق و شوق تو نہیں ہو گیا تھے.....؟“ ”میں مُسکرا دیا۔ ”کیوں کیا وہ سارے جو راتوں کو جاگتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟“ ”فقیر ابھی ہنس پڑا۔ ”ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، ٹو شادی کیوں نہیں کر لیتا، کب تک یوں اکیلا درد رنوار ہوتا رہے گا؟“ ”اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر.....؟“ ”فقیر نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”اونٹیں یار.....! یہ زنانیاں بڑی مصلیٰ ہوتی ہیں، ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اچھا خاصہ مرد اُن کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے، نہ دنیا کا۔“ میں نے غور سے افسردہ فقیر کو دیکھا۔ ”پھر تو میرا شک سولہ آنے سچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیر..... ورنہ تو یہ فوم زدہ نہ بیٹھے ہوتے۔“ ”فقیر نے تازہ بیڑی سلگائی۔ ”کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک..... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچ کیا، ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بہتر بندہ ملا، دوبول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ اُسی دن سے میرا ان عورتوں سے اعتبار اٹھ گیا، میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے، یہ زنانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکر میں نہ پڑتا۔“ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ واردات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا، مگر آوازیں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کُنیسا سے باہر نکلنے لگا تو فقیر نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ”باہر نہ جا اکبرے! کوئی دکھیا رہی ہے، قبر پر چلہ کاٹنے آئی ہے اولاد کے لیے۔“ میں نے حیرت سے فقیر کو دیکھا۔ ”مگر قبر پر چلہ کاٹنے سے بے اولادی کیسے دُور ہو سکتی ہے؟“ ”فقیر نے مجھ بھلا کر کہا۔ ”تو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دے۔ ہم ان کو یہاں آنے سے روکیں گے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔ ٹو چپ کر کے سو جا۔“ میں نے زمین پر سر ٹکالیا، مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔ ”فقیر.....! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟“ ”ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تورات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھ اکبرے..... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ ڈاڑ یکٹ اس کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، سو جا چپ کر کے، کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے، ٹھنڈی رقم ملے گی ان شاء اللہ۔“

اگلے روز فقیر اکٹھیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ”چل بھئی اکبرے، منڈوا دیکھنے چلتے ہیں۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”منڈوا.....؟“ ”ہاں یار! وہ کیا کہتے ہیں سنیا، یہ دیکھ بڑی زبردست کچر لگی ہے بازار والے سنیا میں۔“ میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لبتی کی فلم ریلیز ہو چکی تھی اور سُپر ہٹ ہو کر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے لبتی عرف شہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جا رہا تھا۔ شہ پارہ کا انٹرویو بھی چھپا تھا، جس میں اس نے کھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زادنہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پارہ کا خواب پورا ہو گیا ہے اور اس نے پری زاد کو اپنا خواب گر، اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیر کو اکیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں وہ لوگ دیکھتے ہیں، جو خواب دیکھنا جانتے ہوں، وہ اپنے کسی خواب کو سنیا کے پردے پر جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا، سب سنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے، میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیر نے مجھ سے ملنے کے بعد میں نے سارے اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی بڑس اور کاروبار کی خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دنیا فتح کر لینے کے دعوے..... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لیے

بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ ڈک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا ہمارا ہونا سب برابر ہے، تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، اتنا گھمنڈ کس لیے؟..... مجھے پھر اس دھمن جاں کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی چٹائی واپس آچکی ہو گی، جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکن تصویر جلا کر وہاں سے نکالتا تھا، تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی مورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھنچوانے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھو جا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دکتی ہوں گی، اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں..... اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے زیر استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روتی رہی ہو گی، مگر عدنان نے اسے سنبھال لیا ہو گا۔ اس کی کوئل جبین کو عدنان کا شانہ ہی چٹتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں..... مری جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسر تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیر اصح سویرے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا۔ میں جھوپڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پرانی ولیز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر رُک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اترے اور ان میں سے ایک نے حسبِ عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ ”اکبر تیرا ہی نام ہے؟“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”ہاں، سب خیر تو ہے؟“ ”خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیرے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گور کن سلاے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل، وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں بوکھلایا سا اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پرانی دشمنی چل رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور آج فقیر، سلاے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”دیکھ لے اکبرے! قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر ٹوایسی غلطی نہ کرنا، بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے۔“ فقیر ادھر سے دھیرے دھیرے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلاہ اور اس کے ساتھی قتلِ عمد کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیرے کو اسی کی جاگیر، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا اور فقیرے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی، پھر سے وہی سفر اور وہی انجان رستے.....! مگر میری حالت روز بہ روز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن پٹنے لگا اور پھر شدید تیز بخار نے مجھے آگھیرا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اتارنا پڑا۔ فقیرا مجھے ملنگ کہہ کر چھیڑتا تھا، مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بٹل مار کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دُور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر بد نما سی لکھائی میں لکھا تھا ”خانو کی چائے، غم نہ بھاگے“ ٹھیلے والے نے مجھے ٹھہرتے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آ گیا۔ ”چائے پیو گے؟“ میں نے انکار کیا۔ ”نہیں مجھے طلب نہیں ہے۔“ ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”عجب بھکاری ہو، مجھی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیے نہیں مانگ رہا خانو!“ میں نے فستے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھکاری.....؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے، میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، پر کچھ نہیں ملا..... اب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو۔“ خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا سائیں! تم تو کوئی اللہ لو کہ ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی۔“ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، اکیلا چھوڑ دو مجھے!“ خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی، جس کے تنے کے ارد گرد پکڑی اینٹوں اور سینٹ کا چوبارہ اٹھا کر ایک گول پلیٹ فارم سا بنادیا گیا تھا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے شدہ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا اور پھر جب میری آنکھ مٹھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چند حیا دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آنا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ”چلو بابا.....! کیا بھیڑ لگا رکھی ہے..... جو گی بابا کو ہوش آ گیا ہے، شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے۔“ میں نے چوبک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سٹڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفقاء، بدینت آنکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

وہ سب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے ارد گرد دائرے میں کھڑے تھے، جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقابت سے چکرا گیا۔ میرے ڈمگاتے جسم کو تھامنے کے لیے کئی ہاتھ بہ یک وقت آگے بڑھے، تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔ ”تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ خائونے دوبارہ سب کو جھڑا، جیسے وہ میرا نائب ہو۔ ”ننانا نہیں بابا! جاؤ یہاں سے ابھی۔“ سائیں جلال میں ہے۔ ”لوگ عقیدت سے سلام کرتے وہاں سے بادل خواستہ ٹھنسنے لگے۔ خائونے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ”کھانا کھاؤ گے سائیں؟“ میرا صبر جواب دے گیا۔ ”آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ خانو منمنایا۔ ”آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں! شاید آپ کی دعا سے خائونے دن پھر جائیں۔“ پچھلے سال باڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا۔ ادھر ٹرینوں کی بد حالی نے بھی دھندامند کر دیا ہے سائیں۔“ میں نے جھنجھلا کر اسے دھکارا۔ ”جابل انسان! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دُعائیں اثر ہوتا، تو آج میں خودیوں بد درخوار نہ ہوتا۔“ مگر خائونے سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی طے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے دُہد و تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ غر اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے بال، چہرے اور لباس پر وقت کی دھول اور غم کی ٹکٹیں، چادر پر درد کی سلوٹیں اور جھولی میں ناکامیوں کے بیکر اور کانٹے..... کیا کسی جو گی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے، اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟ میں نے جان ٹھوڑا کر کے لیے بے زاری سے کہا۔ ”اگر تمہاری تسلی میری دُعای سے ہوتی ہے، تو جاؤ میں نے تمہیں دُعادی۔“ خانو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جانے کیا کیا منگتیں مانگتا وہاں سے نکل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات، قصبوں کے لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں یا پھر شاید آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اُسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش! انہیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں۔ اُن سے زیادہ دنیا داری کے داغوں سے ملبوس کاوہ مریض ہوں، جو خود ”شُغائے عشق“ کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ بہ مشکل ایک دن ہی شگونوں سے گزر پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کبل میں پسینے درخت کے نیچے لیٹا تھا، تب ہی اچانک وہی بے وقوف خائونے میرے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے، لہراتا شور مچاتا میرے قدموں سے آکر لپٹ گیا۔ ”تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں! کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں..... جیو۔“ میں نے جلدی سے اپنے پیر لپیٹ کر اسے دھکا دیا۔ ”ہٹو پیچھے، یہ کیا کر رہے ہو؟“ خائونے خوشی سے چلا یا۔ ”سائیں! یہ دیکھو، آپ کی دُعای میرا دس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہے۔ سارے دلہرے دلہرے ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔“ کچھ ہی دیر میں آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے عملے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے مذاہن کا ایک دُور شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد قریب اور دُور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک ہجوم جمع رہتا، جو میرے قدموں میں دس، بیس اور پچاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منگتیں پوری کرنے کی دُعائیں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھکارا تو اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کولاتا رہتا، اتنا ہی ان کی نظر میں معتبر ٹھہرتا۔ میرے بخار اور نقابت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات منہ اندھیرے چپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں، لیکن میں جانتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہر طرف اُسی انسان کا سامنا تھا مجھے۔ اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہانِ خراب میں۔ خائونے مجھے اس بھیڑ کے ہاتھوں آزار میں مبتلا دیکھتا تو ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیتا، مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی ہجوم، پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں، کوئی عورت ڈھائی دیتی۔ ”سائیں! میری بہو، بیٹا نہیں بچتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ دل رہی ہیں، دعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے۔“ کوئی دوسرا کہتا۔ ”بیٹے کو نو کری نہیں ملتی جو گی سائیں! بس، ایک نو کری دلاؤ۔“ تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔ ”بس ایک دُکان کا سوال ہے سائیں، کاروبار بھادو۔“ میں آنکھیں بند کیے منہ لپیٹے پڑا ہوا وہ میری خاموشی ہی کو میری دُعای سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب نکلی کی ایک تختی پر غلی حروف میں ”آستانہ جو گی سائیں“ لکھوا کر لے آیا اور تختی کو درخت کے ایک اونچے حصے پر کیل سے ٹھونک گیا۔ وہ لوگ میری نقابت اور بیماری کو میرا روزہ یا فاقہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو پیری فقری کی نشانی، اوپر سے قدرت بھی عجب طرح مہربان تھی۔ میرے ارد گرد موجود لوگوں کے جھگٹے میں سے کسی نہ کسی کی مراد برآتی اور وہ اُسے میری ”کرامات“ کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ سو میں سے باقی اُن نواہے ناکام، غراؤں کو کوئی نہیں گنتا تھا، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ کالی رات کے ٹھپ اندھیرے میں ایک معمولی دیا سلائی بھی دُور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر کسی روز اسٹیشن سے گزرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دُور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر بھی نکل آیا، مگر یہ جو گی سائیں کا لقب اور حلیہ آس پاس اور دُور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا، جیسے قیدی کے بیروں میں بیڑیاں یا کسی پیداہنی غلام کے ماتھے پر گھدی کوئی سیاہ نمبر۔ میں جہاں بھی جاتا، میری پیشانی پر پشت یہ غلام کی نمبر لوگوں کو میرے ارد گرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دُور ہٹاتا، وہ میرے اور قریب آتے اور تھک بار کر میں واپس اُسی آستانے کی راہ لیتا، جہاں سے یہ نمبر غلامی میری جبین پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی ویرانے کی راہ بھی اپنائی، مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو ویرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ تیزی سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی غفلت کی وجہ سے اس ویرانے کی حرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھکارتے دھکارتے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کسی عجیب ہے یہ دنیا، جب انسان اسے اپنانا چاہتا ہے، یہ اسے دھکے دے کر دُور بھگاتی ہے، ٹھوڑا کرتی ہے، ہر پل سسکا کر تڑپاتی ہے، مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے، تب یہی دنیا خود اس کے قدموں سے لپٹ کر منگتیں، ترلے کرتی ہے کہ اسے ٹھکرا کر نہ جانے۔ اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا، میرے لیے تو سب علاقے، جگہیں، لوگ، موسم اور رویے، سب ہی ایک جیسے تھے۔ کم از کم خائونے ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک ہمیشہ موجود تھا، لہذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا، جس کی مفتی سے میرے اس نئے بہروپ کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر

جشن سا برپا ہو گیا۔ اُداس بیٹھے خائونے نے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”سائیں! کیا بتاؤں تم کو، جب سے تم روٹھ گئے ہو۔ سارا دھندامند ہو گیا ہے۔ سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے، مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی۔ بس سائیں، اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے۔“ میں چپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف کی داستان سن رہا۔ دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پُرانی بند ترین پھر سے رواں کر دی گئی، ہجوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ دیا تھا اس تقدیر نے بھی۔

میں سارا دن سر جھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پُرسینے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمین دار کی تیسری نئی نوبلی ڈیلن اپنی خداماؤں اور خاص کارندوں کے ٹھہر مٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نوکرانیوں نے نذر نیاز کی پراتیں میرے

قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے ارد گرد لگی بھیڑ کو جھڑک کر پڑے بھاگادیا۔ لڑکی نوجوان بھی اور اس کو سب ”چھوٹی سرکار“ کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں سر جھٹکے بیٹھا رہا۔ اس کی چوڑیاں کھٹکیں۔ ”میرا نام گل ناز ہے جو گی سائیں..... رب کا دیا سب کچھ ہے، پر گودا بھی عونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے۔“ اس کی نرم و ملائم آواز پر میں نے نظراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اس مسمیٰ تھی، اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سُہری دمکٹارنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کالونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ پل بھری میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبتی، لبتی، صباور یعنی کاچرہ جھلکتا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”نہیں، اب اور نہیں..... بس..... عورت، چلی جا یہاں سے، جا، پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے۔“ گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی، تو خانو دور سے بھاگتا ہوا آیا۔ ”جو گی سائیں جلال میں آگیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی مراد پوری ہوئی۔“ لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ”اچھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے۔“ خانو نے بڑے دُعم سے جواب دیا۔ ”یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظراٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا، اس کی نیاپار ہوئی۔“ گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جو گی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوب صورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ خُشن کا یہی زہر تو ہے، جوازِ دل سے میری رگ رگ میں سرائیت کر کے میری رُوح کو تمام عمر ٹھسلا تارہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سبے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے نے بند ٹٹھی کھولی اور پچاس روپے کا مڑا اترا سا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ ”ہمارے لیے دُعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے۔“ میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔ ”صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ.....؟“ لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میرے پاس تو فی الحال بس اتنے ہی ہیں۔“ میں نے نوٹ پرے کر دیا۔ ”اتنے پیسوں میں جو گی سائیں شادی نہیں کروا تا۔“ لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اٹھا لو لڑکی، محبت اگر بچی ہو تو بذاتِ خود دنیا کی سب سے بڑی دُعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس اُمید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دُعا ہے، تمہاری منت اور تمہارا تعویذ ہے۔“ وہ دونوں یوں خوش باش اُٹھے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُف یہ محبت کرنے والوں کی ”زُود فہمیاں.....“ محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جان پاتے کہ دنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصل یا وصال سے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام غمراہی مسند پر ایک لحد بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے۔ اور پھر میری طرح یہی ایک خواہشِ دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر اتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مہینے اور سُن سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دُور کھڑے خانو کے ٹھیلے پر بدلتے ریلوے کے لائنس سے اتنا پتا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پاؤں سال سے بھی کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کبرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے خلاف تلے بارش میں بیگیتارہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ جھوٹے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چنچ نکل گئی۔ ”اوہو..... تمہیں تو تیز تپ ہے سائیں۔ میں ابھی حکیم صاحب کو لے کر آتا ہوں۔“ خانو اُلٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا ویدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فتا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تہا و برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دو غلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے نئی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چڑے کے بکس میں سے چند سفوف نکالے اور ایک جا کر کے تین چار پٹوئیاں سی بنادیں۔ ”یہ لو خانو میاں..... صبح، دوپہر، شام۔ دن میں تین تین مرتبہ سادے پانی میں گھول کر پلائی ہے یہ دوا۔ سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ خانو نے کسی تجربہ کار اور مستند تیماردار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات ازبر کر لیں۔ شاید غالب نے خانو جیسے ہم دردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ: ”پڑیے گر بیمار..... کوئی نہ ہو تیماردار“ مگر میرا تیماردار کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعائیں بانٹتا پھرتا ہوں، خود اپنے لیے شفا یابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ چھتہ پٹایا اور مُسکرا کر بولے ”فکر نہ کریں سائیں جی، جلدی بھی پھلے چنگے ہو جائیں گے۔“ میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔ ”کچھ مزید بیمار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟“ حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ سو، اپنی سی کوشش جاری رکھتا ہوں۔ مگر گلتا ہے، یہ ہنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، پر تقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی۔ جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے، اُسے اتنی جینی ہیں۔ خود کو سزا دینا مناسب نہیں۔“ خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سُن رہا تھا۔ حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ”دنیا کی ہر طب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفا یابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے۔ جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو، بیمار عضو کے خلیوں کے دروازے، دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوائیں ناکام و نامراد لوٹ جاتی ہیں۔ اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجیے صاحب۔“ حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دارو کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جہانک لیٹائی اصل دانش و حکمت ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی داناتا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھنا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شذوذ سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیمارداری میں بٹا رہا۔ تیسرے دن ڈھول، بتاشوں کے ساتھ ایک جوم نذر اور نیاز کی دینگیں، سبز چادریں، سُہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیشن کے پلٹ فارم پر آ پہنچا۔ عقدہ کھلا کہ زمیں دار صاحب کی خدانے سن لی ہے اور ان کی گل ناز نے انہیں خوش خبری سنادی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی ان کے آگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مودب سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لارہے ہیں۔ زمیں دار چچی غم کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ شخص د کھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میرے قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دُور ہی

سے اشارہ کر کے اپنے سر کے اشارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ زمیں دار مؤدب سا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ”میں پہلے اس جھلی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی..... بچہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھتا رہا، پر یہ غلط غلط کر پھروں فقیروں کے ذر پر متئیں مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو یہیں اسی قبضے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرنا۔“ میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا ہاسبا جین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر کُئے رہنا ان کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھٹکانے کا باعث ہو گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر لگی، تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سینا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیاں نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے ریگتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک بھوسے پر نیم دراز ہو گیا۔

اگلی دو پہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سر کا یا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دُشت لہجے میں پوچھا۔ ”تم کون ہو، اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”فقیر ہوں، ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے، اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں اٹھایا۔“ ریلوے اہل کار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہ! پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جکشن پر لگی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ۔“ ”نہیں، تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اُتر جاتا ہوں۔“ میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گزر کم ہی ہو تا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بُرا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا، لہذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ جمانے کے بجائے، قبضے سے دُور جاتی ایک گِلڈنڈی کی راہ لی۔ سارا راستہ کنکر اور کانٹوں سے آنا پڑا تھا اور دُور دُور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور راستے بھر دُھول اُڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوہڑ سے پُرے ڈیرہ جمانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جوڑوں نے ایک مسکن بنا رکھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس ذرا سی مشقت ہی نے مجھے مذہال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر سستا رہا تھا کہ دُور سے ایک بوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچے کو بٹھائے خرماں خرماں پیڈل مارتا میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد.....؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چپ رہنے ہی میں غافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا ”اس علاقے میں نئے آئے لگتے ہو جی..... میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمالا۔ کوئی روٹی کھرچا پیے ہو تو بتاؤ جی۔ میں اس علاقے کا ڈاڈا کیا ہوں۔“ میں نے دُور کھڑی مرغ سائیکل کے پیسے سے کھینچتے بچے پر نظر ڈالی۔ ”نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور گڑ موجود ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ بوڑھے مہر دین پر میری کھٹکی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دُور تک چھلی بنگرے اب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔ ”صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ انسان اور جنوار، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوہڑ سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراجی صاف پانی لادوں تمہیں۔“ بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل کمالے! تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی۔“ مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دوپل کے لیے رُکا۔ ”جو اگر سائیں لوگوں کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دوپل پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔“ میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے ٹکون کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں، مگر ٹکون بھلا کب لکھا تھا، لکھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا مینہ برسا کہ ہر طرف غل خصل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور سا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک ہجوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”پنچپن“ سمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفووں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا وی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

خلیل جبران نے کہا تھا ”جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سینچا“ بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا“ مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد، غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے جوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بو چھاڑ تیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا۔ پاؤں میں پرانے پتیل اور عروں پر ناکافی اور چھید بھری برائے نام چھتریاں، وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے پھرے ہوئے تیر دیکھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترنم کے فرائض سرانجام دیتی رہی، مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو ان سب کو بھی یہ خاموشی گھٹنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور ہلکے سے کھٹکار کر بولا ”یہ سب یہاں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لو کو..... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس بھر اور خشک علاقے کی قسمت بھی گھٹنے والی ہے“ مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا۔“ میں نے درشت لہجے میں اس سب کو دھتکارا۔ ”یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید..... اور تم سب بھی زے بدھو ہو“ جو اس کی باتوں میں آ کر یہاں چلے آئے ہو.....؟ بارشیں اپنے وقت ہی پر برستی ہیں، چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی، جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو، ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے۔“ پتا نہیں، انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی، مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور سچی ٹھکر کے چند لوگ آگے بڑھے، کسی نے چادر، کسی نے چاول، ٹٹا اور پنچوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خالی کر دیئے، کوئی جیب میں چند سسکے بھر کر لایا تھا، تو کسی نے دودھ سے بھری گلدوی میرے سامنے دھر دی۔ مہر دین رو پڑا۔ ”ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لو کو! اسے قبول کرو اور وعدہ کرو“ اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر سبیں ڈیرہ ڈالے رہو گے۔“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانا بے فائدہ تھا، اس لئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لاپرواہوں، انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے، اُسے ہرا کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی ”فتح“ جیت سکتا ہے، مگر مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ سو، مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بیٹھتا رہا، پر..... کچھ بارشیں صرف بھر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں، جو دل کے سنگتے آگلن کو بھگودے، ایسا ساون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟ اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی بستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا یا اس پاس کے علاقوں میں اس اتفاق بارش کا خواہ مخواہ چرچا کیا، تو میں پچپ چاپ یہاں سے اٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگا یا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ”گناہ“ کرے گا نہ کسی اور کو کرنے دے گا۔

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی بستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں پانا ب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس باریہ جو گی سائیں کا لقب اور ان بھولے بھالے لوگوں کی یہ ضعیف الاعتقادی کا بت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت مؤثر انداز میں بستی کے لوگوں تک پہنچادی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد مغرب تک کے وقفے میں اگاؤ کا ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دور پگڈنڈی پر آ بیٹھتے اور دُور ہی سے دُعا کی التجا کر کے واپس پلٹ جاتے۔ انسان اور دُعا کا بھی کتنا پرانا، کیسا ازلی، ابدی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دُعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا انسان؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کر لیتا تھا، مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتی تھیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پروگرام شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دکتھی ہو گی؟ کچھ چروں کا خسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے، کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دگنی چو گنی دل کش اور حسین ہو چکی ہو گی۔ کاش! دنیا کے کسی جزا کے پاس تو وہ نفرت ہوتا، جو ایک ہی چر کے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا زہر نکال پھینکتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھٹکارتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ”یہ ٹھکور دین ہے سائیں لو کو..... اپنا ٹھکورا..... اس کی نوا سی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دو تو دُعا کے لیے اسے یہاں لے آئیں۔“ میں نے ناگواری سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں، پر یہ جھٹلا میری بات سمجھتا نہیں، کہتا ہے، سائیں سے روبرو دُعا کی درخواست کر دیکھو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔ دُور کی دُعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی۔“ میں نے جان بھر انے کے لیے کہہ دیا کہ میں دُعا کر دوں گا، اگر تین دن تک لڑ کی کی طبیعت نہ سنبھلے، تو اسے لے آنا۔ ان دُور دراز کے علاقوں میں جوان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹریا کے یاد گیر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں، جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ٹھکورے کی نوا سی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چنگی ہو جائے گی، مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب ٹھکورا سیاہ چادر میں لپیٹی گم ضم سی ایک لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادل نخواستہ کھاوے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ گلابی شام کے ڈھلنے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگک پل بھر کے لیے چکا تو ایک لمبے کے لیے میری نظراس کی نظر سے ٹکرائی۔ اُف..... کس قد ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح جس کا سب کچھ لوٹ کر، جاتے ہوئے لیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگائے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شکور اپنی دُھن میں بولے جارہا تھا ”کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنسی بولتی تھی، ساری سکیوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانیوں سے، باغوں میں ٹھجولے ٹھجولتی تھیں، ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کد کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ، پھر نہ جانے کیا ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی، ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان گڑیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی، اب تمہاری دُعا کا آسرا ہے، کچھ ایسا پڑھ کر پھوٹو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے۔“ اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دونوں سے لاتعلق سی بیٹھی، کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی، دُھلی شام میں، اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سرسوں سی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شکورے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیے۔ خود اپنے لیے دُعا مانگتی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکورے سے کہا ”اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو د کھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔“ شکورے نے آہ بھری ”آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی، پر یہ بگلی کسی کی سُنتی کب ہے، میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کر دیا اس نے، کہتی ہے، اس کا جو ہونا ہے، ادھر ہی ہونا ہے۔“ میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا ”کیوں لڑ کی! کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی.....؟“ سکینہ میری ڈانٹ سے گھبرا سی گئی ”جی..... وہ.....“ مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ ٹھل کر بات نہیں کر پارہی تھی، غرُجھا کر بس اتنا ہی بول پائی ”ٹھیک ہے جی..... آپ کہتے ہو تو مان لوں گی۔“ شکور اخوش ہو گیا ”دیکھا سائیں! میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا۔“ شکور اسکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اپنے آس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج ٹمکھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا وہ کرب، کیا تھا؟

اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شکورے کا ذکر، چھیڑ دیا ”کل سے ذرا سکون ہے، نیناؤں کے گھر میں، کسی ہنسی بولتی چڑیا سی تھی بے چاری سکینہ، اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے“۔ میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔ ”اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے..... اور اس کی یہ حالت کب سے ہے؟“ ”تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کروایا، بڑے پھیرے لگائے ہیں شکورے نے

آس پاس کی ساری بستوں کے، کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی، جہاں اس نے دُعا نہ کی ہو، علاقے کے سارے وید، حکیم اور طبیب بھی تھک کر بہت ہار چکے ہیں۔ کسی نے شکورے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لاڑکی کو لے کر کسی دُور دراز کی بستی چلا جائے، شاید ماحول بدلنے سے کچھ بہتری ہو، مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار، شکورے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دُعا سے علاقے میں بارش برسی تھی، اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکور واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر۔“ میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا ”کہاں لے گیا تھا شکور دین اپنی نواسی کو؟“ ”شکر گڑھ، وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے داماد کا۔“ میں چونک سا گیا ”یہ تو وہی علاقہ تھا، جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کینن واقع تھا۔“ ”کتنار عرصہ رہی وہاں سکینہ؟“ ”لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس جھلکی کا من نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو بھتی رہتی تھی۔“ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اُداس ہو گیا ”اور پتا ہے سائیں جی! کبھی کبھی تو بالکل جو گٹوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔“ مہر دین کی باتیں سُن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکورے کو میرے پاس بھیج دے۔ سر شام ہی شکور سکینہ سمیت آ گیا۔ ”حکم سائیں۔“ ”سکینہ کیسی ہے اب؟“ ”شکور دین نے گھر اسانس لیا“ ”پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں! ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی د کھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر، ڈاکٹرنی کا پتا لگانے اور وقت لینے کے لیے۔“ میں نے اپنے اندر ابھرتے ایک عجیب سے موہم خدشے کی تصدیق چاہی۔ ”جب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تھے، ماحول بدلنے کے لیے، تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا؟“ ”شکورے نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالت زار بیان کی ”وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی! وہاں بھی سارا دن گم ضم بیٹھی رہتی تھی۔“ سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لاتعلق سی بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک بچی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے منت کی ”سائیں جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ دُعا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بخار ہے اسے تین دن سے۔“ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بڑی طرح دھکا دوں۔ میں نے مرد کو جھاجڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھ رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلامی کی ”ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے، بس آج کی رات کی سختی ہے۔“ شکور اگاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ

سرگوشی نہیں سنی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی، جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ملیں گے، لہذا حسب معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا شکر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکور اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکور نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو، مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔

اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ، جھلکتی کرنوں کی صورت، بن سایہ جان داروں پر برسائے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا۔ ”میرے کا کے کا بخارا تر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم کبھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گا یہ بخارا اس کی۔ بڑا ترپا ہے ساری رات بستر پر، جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ بچ بتاؤں سائیں، میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا، مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا دنگا بھلا چڑگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قربان جاؤں میں اپنے سونہلے رب کے، اُس نے تمہیں ہم فریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے، اُس بستی میں۔“ وجوش میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکورے کا بچہ رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفایات ہو جائے گا اور اس کی کبھی ہوئی بات ہو، ہو ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے، سکینہ بھی اُسی دن واپس اپنی بستی پہنچی تھی، جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اُسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا، اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا، جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر ٹپکنے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی، وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں، مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور پگڈنڈی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے ہتھکی زمین سے اٹھتی سراب کی لہروں میں مجھے شکورے کا ہیولا دیرے دیرے لائٹھٹا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے عرصہ کھائے گھڑی سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر تفکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ ”کاش! میں اس وقت کچھ اور مانگ لیتا، تو خدا وہ بھی ضرور دے دیتا“ مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکور اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت، ہر دعا کا بدلہ نظر آرہے تھے۔ شکور اور میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”شہر کی بڑی ڈاکٹر نی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی..... اس نیازی کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک وہاں ہی ہو گی، ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا۔“

سکینہ حسب معمول عرصہ کھائے کھڑی تھی۔ میں نے شکورے کو دو لمحے درخت کے نیچے سستانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کم زور اور مضطرب وجود کو شکورے کے پیچھے چھپالیا۔ شکورے نے سوالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی ”کچھ دیر سستالو، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھو کھا لگنے والے خانو کو جانے ہو؟“ شکورے نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”ہاں جی..... وہ میرے داماد کا ہمسایہ ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی تو کوارٹر ہے میری بیابا بیٹی کا۔“ ”اور اس علاقے کا چوہدری.....؟ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟“ ”نہیں جی، براہ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاہ پر دعا کے لیے گیا تھا، تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دعا کرتے دیکھا تھا انہیں۔“ اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکورے کو ایک جانب بیٹنے کا اشارہ کیا اور براہ راست سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سٹ گئی، میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی ”کون ہو تم.....؟“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رتوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر بگ روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا سوال غن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے نانا کی طرف دیکھا، جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی ”سائیں یہ میری نواسی.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”سکینہ کو جواب دینے دو“ سکینہ مزید بول کھلا گئی ”وہ جی..... میں..... میں تو بس سکینہ ہوں۔“ ”نہیں، تم وہ نہیں جو“ نظر آتی ہو۔ ساری دنیا کو دعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے رب سے مانگتی ہو، پھر خود کو اس جو گن کے بھیس میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیرنی بنی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو اور اپنے گھروالوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولو، بولتی کیوں نہیں.....؟“ شکورامیرے غصے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل رد ہانسی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں چھپالیا، پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریشم کی بنی ہوتی ہیں، لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بلاؤں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اٹھ کر جانے کو نہیں تھا، مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادل خواستہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ اور آنکھوں میں اٹھتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کی کرامت کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے ٹھکنے لگی تھی، جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق، مگر سچ یہی تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر جو گی سائیں کی ٹبر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی، جہاں لوگ میری دعا کی قبولیت کے لیے بھٹکتے رہے تھے اور آج تک ان سب جگہوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دعا بھی قبول ہوئی، دراصل وہ سکینہ کی دعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مرید بنتے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ ان کی یہ دعائیں ایک نڈھال اور لاغری لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں، میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غربی اور اپنی معاشی مشکلات کا رونا روتی رہتی تھی اور خانو کا بانڈ ٹھکنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ ٹھک جائے، تو ان کے دن پھر جائیں گے، خشک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چوہدرانی کو اولاد کی خواہش ہے، جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا، کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جو گی سائیں کے لقب نے، لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو درکنار، خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی، ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیں، بابوں اور جو گیوں ہی کو اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں، کوئی سائینڈ، جو گن یا بی بی ان کی نظر میں دُکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں یہ دنیا مردنے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رتبہ، کوئی عہدہ، کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی، اس نے حوا کی بیٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سونپے کی طرح کلہا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پڑے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب ب سری کے لیے آگ کا لاد روشن کر لیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے آئے کہ اگر مجھے ناگوار خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے، میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گوینے اس لٹ سے جان ٹھکانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو نعتیہ اور حمدیہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں، کچھ صرف صوفیانہ کلام کی لے پکڑ لیتے ہیں، گویا جھگڑا سڑ سے نہیں سنگیت سے ہے، لے کا نہیں، صرف تال کا ہے۔ میں جب دینی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور سُریلی اذان سُنی تھی۔ یہی حال میرا اتہین کی مسجد کے ایک مؤذن کی خوش الحانی غن کر بھی ہوا تھا۔ ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے۔ انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دینی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورہ رحمان کی تلاوت غن کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری روح کے کچھ دھاگوں، خیر کے کچھ ریشوں سے بھی جڑا ہوتا ہے، خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت سُریلا تھا۔ بابا بلھے شاہ کا کلام گڈوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سُر نکھیر رہا تھا۔

جا دس دے دلبر مای نوں
میکوں یار بھلایا جاندا نہیں
سر رکھ کے یار دے قداماں وچ
سر فیر اٹھایا جاندا نہیں
میرا دل اک اے، میری جان اک اے
میرا دین اک، میرا ایمان اک اے
جدوں رب رسول قرآن اک اے
دوجا یار بنایا جاندا نہیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھائل روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے، مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

کہ دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور، کم زور اور بے بس انسانوں کو سدا و حضوں میں تقسیم رکھتی ہے، ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے، مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں اک بخارہ، جس کے لیے نہ کبھی زمین مہربان رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے، تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری 'آپ رورہے ہو سائیں جی.....؟؟' میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں، سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے اس پاس نظر ڈالی، ہستی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے جگ راتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہر دین، اور شکور ابھی بیٹھے سر دھنتے نظر آئے۔ 'ہاں..... کچھ یاد کر کے آکھ بھڑائی، تمہاری آنکھیں بھی تو ہر لمحہ چمکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو۔' سکینہ سر جھکائے بیٹھی رہی، شکور نے اٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہر دین نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھادیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہر دین بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے نانا کے سامنے گھل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا 'کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی۔ میرے گھر والے تو بس ایسے ہی بلکان ہو رہے ہیں۔ خود ہی رُل گھل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہوتا ہے.....؟؟' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا 'پھر ایک دم دنیا کیوں تیاگ دی تم نے، جو گن کیوں بن گئی ہو.....؟؟' سکینہ نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں 'جو گ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی..... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا.....؟؟' میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی، دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی اک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے، یہی عشق کا فرما رہا ہے، ہر عذاب کے درپردہ، اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے، ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنا دیتی ہے، جو گی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے، فقیر کے بہرہ روپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی محبت کے مارے بد نصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ لڑکی تھی، جس کا دل بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لیے چمکنے لگتا تھا، ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گدگداتی تھیں، لمحہ بھر کے لیے ٹھہرے بادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسی ہی ایک کالی رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری ٹو کریوں میں باغ سے آم چڑا کر جمع کر رہی تھی، تب ہی اُسے علاقے کے ایک گہرو، سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا، جو شہر کی یونیورسٹی سے ایم اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر کند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی، کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ، ہر رابطہ میٹر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ ہیرا رنجھا، سستی پنوں، سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد، الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے، مگر یہ پہلی نظر..... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا، نظر کے زہر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لا کھ انکار کریں، لا کھ مذاق اڑائیں، مگر کچھ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چوٹی دا من کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار طے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے، ساج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو، یہاں بھی وہی ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا، بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبردار باپ کی اتنا ایک مزارع کے گھر رشتہ لے جانے کے آڑے آگئی، ویسے بھی علاقے کا پنواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پنواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رجو شکل و صورت میں بھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب تھی، اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا۔ وہ تو اس کی یونیورسٹی کی ٹیچنوں کی دعائیں مانگتی پھرتی تھی، تاکہ اس کے دل مگر کا شہزادہ وہاں گھر لوٹ سکے، مگر جب اسے پتا چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں، تو اس کے سینے پر بے یک وقت کئی سانپ لوٹ گئے، جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ ورنہ ہر دوسری آفت آ کے گزر بھی جائے، ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جیسے لاڈ سے سارے گھر والے رجو کہتے تھے، اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بستی بھر میں صرف وہی ایک سانول کے جوڑ کی ہے، اس کے حسن کے چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے روپ کا چراغ کیا جلیے گا، مگر اس نے جو سوچا تھا، سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کئی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکا ڈالنے آگئی تھی۔ رجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے ٹھہر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے وجہہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں، جانے دنیا میں محبت پہلے اتری تھی یا رقابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانس بند کر دینے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ رجو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی مراد بڑائی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دو پٹا ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور مان کی خاطر وہ رجو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں، مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکہ، یہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ، بہن بھائی اپنی محبتوں اور خد متوں کی ڈہائی دے کر کسی اپنے ہی چھیتے کی محبت لوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضد، ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا، کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باراتوں میں سے ایک بارات تھی نمبردار کے بیٹے کی۔ سانول کی جینج کیا چڑھی، سکینہ کے دل کا دریا ہمیشہ کے لیے اتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور مجبوریوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جس کے عود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت ٹھہر کے لیے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ پُپ رہی۔ محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس

پردیباڑ سے سخت الزامات لگاتی ہے۔ بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طنز کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے، مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے اپنے رشتوں کا دفا دار 'زمانہ شناس اور مخلص' کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گلن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رنجو کی پلکوں کی ڈولی چڑھ گیا، سارا گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور بھلی جوڑی دیکھنے کے لیے اُٹھ آیا تھا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو خدا بہتر جانتا ہے، مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رنجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رنجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا، تب ہی سے سانول کی ماں، بہنیں رنجو پر صدقے واری جاری تھیں۔ نصف شب تک رسمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا۔ سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول بتاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قبعتوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آگن تک بھی آرہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹتا اگر ان ہنسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے، جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ مگر کیسے چھلنی ہوتا ہے اور سینے سے جلنے دل کا دھواں کیسے لھکتا ہے 'جب اپنا ہی سانول کسی اور سانوری کے ساتھ شپ عروسی منا رہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر اسے ایسی چپ لگی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے۔ جسم کے اندر بہتا خون سوکھتا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکرا نہی بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور بہتی ٹسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جانے پر، لہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا، کبھی کبھی ٹسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دن لاغر اور کم زور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں، مگر مرض کا سرا نہیں ملتا، مریض سو کہہ کر کاٹھا ہوتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور وید اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر ہٹا کوئی چوٹ لگے، ہٹا کسی بیماری کے، اس مریض کا وزن دن بہ دن کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کی عرفی پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے، جسم کی شادابی خشک ہوتے پٹے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں گن تھا، ایک آدھ بار قصبے کے بازار کی سی درگاہ، مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں پڑا گیا، یا شاید وہ سکینہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں، جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانکا اور بھلا تھا اس کا محبوب، مگر رنجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس نکرانہ کی خبر ملی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے سانول اب بھی ٹھپ ٹھپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلٹے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بننے دیتے۔ رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈاکا مارا ہوتا ہے، اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رنجو بھی کسی ایسی ہی تیش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر سوچے چپے تھے۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے پرانی محبوبہ کی محبت جاگ اٹھے۔ رنجو سوچ سوچ کر ہلکا ہو گئی، تو پھر آخر کار اسے وہ خوف ناک فیصلہ کرنا ہی پڑا، جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ فنا کر دینے کا فیصلہ، جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں، وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رنجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق مٹوں دودھ خرید کر ساری بستی میں تقسیم کر دیا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکینہ کی ماں نے پیتل کی مٹکی سے دودھ نکال کر کنواری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفیعوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گبر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور میٹھے دودھ کی تاثیر ہی سے کچھ پل کے لیے اس کی نڈھال سی ڈھاری تو انائی محسوس کرے۔ سکینے نے دودھ کی کنوری اٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری آواز سن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھٹا گئی۔ یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں..... اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ سکینے کے ہاتھ میں کنوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینے نے کنوری نیچے رکھ دی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سننے لگی۔ پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینے کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینے کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرائی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ گھگھٹنے زبان تک آگئے۔ سانول نے سکینے کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کوان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے، مگر سکینے کا باپ ابند ہو گیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینے کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اُسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اور کچھ تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے، رجبو کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی ہی میں سے ایک کنوری نکال کر سانول کو تھمادی، جو اس نے ایک سانس میں حلق سے نیچے اتار لی اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ سکینے کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پاتا تھا کہ لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا، سبھی سانول کی جانب لپکے، سکینے بھی ساری لاج شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گلال نکھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینے کی نظر آخری بار ٹکرائی، اُن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی آداسی تھی۔ سانول کو کچھ کہنے اور سکینے کو کچھ سننے کی مہلت ہی نہ ملی اور سانول نے وہیں سکینے کے سامنے دم توڑ دیا۔ ایک قیامت آگئی، سکینے پر تو جیسے سستہ طاری ہو گیا۔ سکینے کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔

رجو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس نے لمحے بھر ہی میں صحن میں بنے کنوئیں کی منڈیر ٹاپ کر گہرائی میں چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرائی نے بروقت اطلاع کر دی اور رجو کو زندہ کنوئیں سے نکال لیا گیا، مگر وہ زندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس کی روانی اور دل کے دھڑکنے کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ.....! سات دن بعد رجو کا سستہ ٹونا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روٹی۔ اُسے پتا چلا کہ سکینے کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مارا۔ ساری بستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینے کی ہو سکتی ہے، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کر دیا، تو رجبو نے اپنی عزت کی پروا بھی نہیں کی اور سیاہ چادر اوڑھ کر سکینے کے گھر پہنچ گئی۔ سکینے اور رجو کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھتی رہیں اور پھر رجو یوں لپک کر سکینے کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانوسیا ب آگیا۔ صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ اُن دونوں کا محبوب اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا ڈھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورے ٹانہیں حقیقتاً دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا عذاب سے واقف تھیں۔ رجو نے پولیس کو اپنا سچا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ سکینے کے گھر والے رہا ہو گئے اور رجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھٹی نے سکینے کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ سچ کر لندن ہو گئی۔ ایک ایسا پارس بن گئی، جس سے چھو کر لوہا تولوہا، مٹی بھی سونا بنی گئی۔ اسے شاید یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لیے دیاترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی گھلے، صرف اوروں کے لیے ہی گھلے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ وہ مانگتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر دعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی۔ خاندان بدوش بخاروں کا جلایا ہوا والاؤں سرد پڑ گیا تھا۔ بخار سے نے آخری تان لگائی اور محفل برخاست کر دی۔ جانے اُس لمحے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بخارہ ہوں اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بخاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے روپ کا سونا کون بیچتا ہے؟ روپ کے سودے صرف روپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے روپ، بد صورت ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے، خاک کے بدلے خاک! شکورا اور مہر دین سکینے کو لے کر واپس جانے لگے، تو میں نے شکورے سے کہا۔ ”اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نواسی بنے بولے اور پھر سے عام زندگی کی جئے.....؟“ شکورا اثر مند گی کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مہر دین نے اس کی مدد کی۔ ”یہ ساری بھلا بتانے کی باتیں ہیں سائیں جی! اثر مند گی ہی اثر مند گی ہے اور پھر تم سے کون سی بات ٹھہی ہے سائیں! یہ

نیاڑاں تو بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے، اس کا بچہ گھربار ہو، بال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی.....! بس تم دعا کرو دو ہماری سکینہ کے لیے۔“ میں نے سر ٹھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ ”یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دُعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں، اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے لیے خوش حالی اور اچھے گھربار کی دعا کرے، یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا۔“ مہر دین اور شکور اسر جھکائے چپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سورے سے انگڑائی اور انگڑائی سے زندگی جاگنے کا استعارہ جوڑ دیا گیا ہے۔ سکینہ کی بستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی، گھروں سے مرنوں کی بانگیں اور چھتوں کی چنچنوں سے زندگی کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات، قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی، سرکتی، پھیلتی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ بستی کے دروہام اور آنگٹوں میں اترنے والی.....! میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتا پوچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی ترچھی لکیریں کھینچی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں ساری بستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنا دوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا مجذوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، وہ دوہاتھ، ہتھیلیوں کا چاند تو خود ان کی بستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے تو ہم پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی، تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دُعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھجکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کہیں بے یقینی ہے ہمارے اندر، یا شاید یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں.....؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا کہ میں اب اس ڈھونگ کا بو جھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی سستانے کے لیے کمر لگائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی مرغ سائیکل دوڑاتے، ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سب خیر تو ہے کا کے.....؟“ بچے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں!“ کچھ نہیں سائیں جی! دادا نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں..... بس اب میں چلا۔“ وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملنگ ہی ہوتے ہیں، اپنی رحزیر خود ہی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھا تھا، مگر دوپہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ ہڑ بڑایا ہوا سادہاں آن پہنچا۔ اُن دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دُور سے پڑھی جاسکتی تھیں۔ ”سائیں جی! سب خیری صلا ہے ناں.....؟“ ”ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو.....؟“ ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے بڑ نہیں پائی۔ ”وہ جی سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لیے بہت بڑا سفا دیکھا ہے۔“ میں ہنس پڑا۔ ”بس اتنی سی بات ہے، تم دونوں سکینہ کے بڑے سنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے..... میری زندگی پہلے ہی کسی بڑے خواب سے کم نہیں ہے، جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکر مند نہ ہوا کرو تم لوگ.....! کچھ نہیں ہو گا مجھے!“ لیکن میری اس بے فکری کا اُن دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکور ابولا۔ ”بات اتنی سادی نہیں ہے جی! سکینہ کے خواب بچے ہوتے ہیں سارے..... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔“ میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔ ”مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو، آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں.....! میرے پاس کھونے کے لیے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے۔“ شکورے نے گہری سانس لی۔ ”سائیں جی! اب میں کیا تاؤں تمہیں، میری تو زبان جلتی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے خدا نخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے..... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔“ مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکور اگھرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے ارد گرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی ختم ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑے، اب لمبی نیند سونے کو جی

چاہتا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موند لیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں، مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چچہاہٹ! اک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دُور سڑک کے کنارے ایک بڑی اپورنڈ گاڑی کا بوٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بوٹ پر ٹھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جوڑے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”اور کتنا دیر لگے گا کم بخت..... سارا دن لگائے گا کیا.....؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بوٹ پر ٹھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس دیرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جھنکے گا۔ میں کبیر سے خاصے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، مگر میں نے لاتعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ”باباجی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے.....؟“ میں نے بظاہر لا پرواہی سے تصویر پر ایک اچھٹی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیے سے..... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام..... کون ہے یہ آدمی.....؟“ محافظ نے گہری سانس لی۔ ”یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر.....! ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کمانی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے میرے قریب یوں دیر تک بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف آسکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور ٹٹوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آجاتی، لہذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں بہتری جانی۔ ”تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی کبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں، کبھی جگہ آنا جانا لگتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، جاؤ کہیں اور تلاش کرو..... میں ذرا ڈیرے کے لیے پانی بھر لوں۔“ محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے ٹھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی بار مارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں، تو کل وہ اس راستے پر ضرور پھٹتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھڑے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر خان جیسا وفادار تو کبھی تک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ذرہ برابر بھی امکان رہا ہو گا۔ میرا دل ایک بار شدت سے چلا کہ میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر یعنی کے بارے میں پوچھ لوں، پھر میں اسے اپنی قسم دے کر منالیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُبال پر قابو پایا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لیے ہٹا کبھی واپس نہ جاتا، یا پھر خود بھی غم بھر کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہو گیا، میرے دل و دماغ میں.....! یادیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، یا ماضی کو بھلنا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں، چاہے ہم ساری عمر بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہر دین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی، شاید شکورے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لیے کافی فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”میری فکر نہ کرنا، میں بہت پہلے مر گیا تھا، اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے، ہو سکے تو اپنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا جیون ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے لیے وہ دُہری زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا، مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے، سو، جیسا دیں ہے، ویسا بھیجیں اپنا لو۔“ میں نے شکورے اور مہر دین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ ہستی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد لوٹ آنے کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے.....! جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ رُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔

صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں چپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر ٹپک گیا۔ بس دیہاتیوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ گھنٹہ بھر بچکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چو تک کر سر اٹھایا، آگے پولیس کانا کہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ اُن کی باتوں سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر زور سے چلا یا۔ ”یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔“ (جاری ہے)



..... ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد اماراتر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سٹڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گت بد صورت رفوئوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سٹڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پولیس والے کے اس طرح چلنے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگی بمینا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑ کر دیا گیا، مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کترارہے تھے اور میری ہر جنبش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جبی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک افسر سرکاری جیب میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاندھوں پر بے پھول بتارہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھس کی۔ انسپکٹر نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا، پھر اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ”اس کی تلاشی لی ہے.....؟“ ”نہیں صاب جی..... ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔“ انسپکٹر نے غصے سے انہیں جھاڑا ”اوئے..... اس ویرانے میں بارود جھنچے والا آلہ تمہارا مال لے کر آئے گا۔ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خود کش ہے، جس کی خبری ہوئی تھی؟“ ”صاب جی! حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی لمبے بال، گھنی لٹوں جیسی بڑی داڑھی، سرخ آنکھیں، ملنگ کا بھیس..... یہ تصویر دیکھیں ذرا۔“ سب انسپکٹر نے جیب سے ایک سادہ کانڈر بنانا کا ٹکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا تو پتا چل چکا تھا کہ انسپکٹر علاقے کا تھانے دار ہے، اور وہ کسی خود کش کی تلاش میں یہاں تاک لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے، تو میں نے تھانے دار کو پہلی بار مخاطب کیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آ رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروالیں۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔“ میری آواز سن کر وہ سارے یوں اچھلے، جیسے میں نے واقعی کوئی خود کش دھماکا کر دیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لہجے اور ٹنوں بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قہقہے اتارنے کو کہا۔ میں نے اپنا پتھر اپنا چولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے دور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکلیں کس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ پنے اور گڑی ملا تھا۔ تھانے دار نے جیب کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قہقہے پینے کا حکم دیا۔ دور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کینن نما کھوکھ والے نے تھانے دار کے لیے ابلی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک چینک اور چند چھوٹے پڑانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنادیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیر اعظم سے زیادہ تھانے دار کا کردار ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سدا غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے اذراہ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ”جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم زیر حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے حلیے سے میل بھی نہیں کھاتا..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو.....؟“ میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسون، کل تک جس حلیے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیا میری راہ میں پلکیں بچاتی تھی، میری طرف پیٹھ کر کے چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جو گی کا بھیس مجھے ایک عادی مجرم ثابت کرنے پر ملا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلنے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلہ تبلیغ یا دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا ”یہاں سے ریاست پور کتنی دور ہے.....؟“ تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”پنشنڈ میل، کیوں؟ مگر تم فکر نہ کرو، ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔“ تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیب میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے۔ ان میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خود کش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی عجوبے کی طرح برت رہے تھے۔ خود کش..... ہم بھی کیسے بد قسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آ رہے ہیں۔ خود کش، دہشت گرد، در انداز، انتہا پسند، کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدر میں۔ ساری دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جبار ہوتا ہے۔ مگر نہ جانے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لغت میں دہشت کش، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جینا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ خلاف معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پرسکون اور خوب صورت تھی۔ تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہو گی۔ تھانے کے پس منظر میں دور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا اینٹوں کا پل تھا، جو تھانے کے مرکزی چوٹی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی، مگر انگریز دور کی ایک پڑھوہ عمارت استادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ یہ ظاہر پل اور دیواریں ایک جیسے اجزاء اور ساخت کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر ”پل“ ملاپ کا استعارہ ہوتے ہیں، جب کہ دیواریں جدائی کی علامت بن جاتی ہیں۔ پل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جدائیاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے اور باقی دنیا کے درمیان جدائی کی فاصلہ کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا، جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سالکوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

زیادہ پانی والی تھی سی چائے کا ایک پیالہ مجھے پکڑ دیا۔ ”جانے ہو، دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہو گیا، تو سیدھے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟“ مجھے بھری میں مجھے سکینہ کی پیش گوئی یاد آگئی، تو گویا میری فاس دہشت گردی کے الزام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے ورثاء کے طور پر ریاست پورے شکورے اور مہر دین کو بلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان بچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے مسودے مکمل اور کسی بھی غلطی یا جھول سے پاک لکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ قضائے میرے گرد اپنا جال مکمل بن لیا تھا۔ اب تو سکون ہی سکون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ نازا ادا جھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آ بیٹھی۔ کاش! میں ایک بار سے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح مچل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں..... پھٹے پرانے کپڑوں والے بچے..... اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے..... دل کو اچھی لگنے والی..... مہنگی چیزیں..... کسی دکان کے بند شیشوں سے..... پہروں لگ کر تکتے ہیں ناں..... میں بھی تم کو یوں ہی محسوس کرتا تھا۔

میں بھی اسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اُسے ایک بار تکتے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر اپنے خوابوں میں مرادیں پالیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرٹ گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کوئلہ باتھوں کی جادوگری سے میرے مجھے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظری نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔ ”چل بھی ملگ بادشاہ.....“ تھانے دار صاب تھے ہارے ہیں۔ ”میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے ہتھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مودب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا، پھر ایک افسر نے جو عہدے میں ایس پی تھا، مجھ سے پہلی بار براہ راست بات کی۔ ”ریاست پور سے صرف اتنا پتا چلا کہ تم نے کچھ مہینے وہاں بستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا..... اب آپ کی یہ حوالات ہے۔“ ایس پی نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر تمہارا یہ لب و لہجہ، یہ اعتماد، تمہارے حلیے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہمیں الجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد، میں جانتا ہوں، جن جگہوں کا تم نے ابھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کارڈ پر ڈیکھا جاسکے۔“ میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ”حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ جیسی کو تواری کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑائے، اس کی آواز کانپے، تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی بنا گھبرائے اپنا مدعا بیان کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کریں.....“ میں خاموش ہوا تو ان سب کے تنے ہوئے چہروں پر مزید کئی ٹھٹھکی پڑ چکی تھیں۔ ایس پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ حلیے سے کافی حد تک مشابہہ تھی۔ ”ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری ادھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملنگ کے حلیے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سیکڑوں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک..... لہذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری غرائبی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔“ اس کا لہجہ اور ان سب کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتاتا۔ میں جس شناخت سے ساری غم بھرا گستاہتا تھا، وہ ایک بار پھر میرا مذاق اڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلع کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کر وادی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آ کر پولیس سے ملے۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شکورے اور مہر دین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھکار رہے تھے، جب کہ وہ ڈہانیاں دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جوگی سائیں ہے، مگر وہاں کوئی ان کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیے تھے۔ شکورے اور مہر دین کو تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے۔ ”سائیں جی! تم ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم وہ نہیں ہو، جو یہ سمجھ رہے ہیں۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید میں وہ نہیں ہوں، جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینہ کا دیکھا ہوا ہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔“ وہ دونوں میرے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شکورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینہ نے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دعا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رورو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو، سائیں جی کو ان سب کی غم لگ جائے، مگر سائیں کی آنے والی فائل جائے..... اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آ کر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑ کائیں۔ ”اٹھ جاؤ ملنگ بادشاہ..... تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔“ میں حیران سا حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ”معاف کرنا فقیر..... ہم بھی انسان ہیں، ڈیوٹی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو بالکل ہی شکایت بھی نہیں کی۔“ تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے، ناشامیز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ”تم نے کوئی شکایت یا گھم نہیں کیا۔ اس بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اُسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے فکر پر منس کی رپورٹ بھی کلیر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جاسکتے ہو۔ مگر پہلے ناشتا کرو۔“ میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر

تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“ کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔“ تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ”شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟“ میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ”اُن سے کہیے گا یہاں فنا ہونا، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں لکھی ہو گی، وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔ میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں۔“

میں اکرم خان کو وہیں پہنچا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر وہی پل اور وہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف جاتی پگڈنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چلنے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گزرا کر ہنس پڑے۔ شریرونندیں ایک بے گھر بھارے کے ساتھ آکھ پھولی کا کھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکنے لگیں۔ بادلوں نے بھارے کو بھیگنے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں ہندو ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سُنے تو اسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے آنکھیلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اوٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں رُکا۔ بھیگتا رہا، اور بہت دُور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی رستے میری تنہائی پر مُسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تخیل کی کرشماتی دنیا سے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے جڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھیگنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی تیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ”کہاں جا رہے ہو صوفیو! میں پہنچا دوں؟“ میں نے اس دیاوانے سے پوچھا۔ ”یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟“ وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ”راستہ تو کہیں نہیں جاتا..... ہمیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیر..... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔“ مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے مَن کی الجھنیں بھلا کر لوگوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ”دل والا“ ہے۔ تیل گاڑی نے مجھے کچے سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے اکاؤ کا سوار یاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے گزرتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بھار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھالیا اور ہٹا پوچھے ہی ایک ویرانے سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چڑاسی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بھار نے میرے حواس اس بُری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کروادیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچنے ہی کسی قلی یا مزدور سے کھلو کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رُکی تو میں بھی ٹی ٹی کو ہٹاتا ہے لڑکھاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا ہر حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ ٹھنٹی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے جلتے ٹکٹے برقی بورڈ پر پڑی، جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھٹا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہ تو میرا پناہ شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچہ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں ٹرین کے نیچے آکر کٹ جاتا۔ میرے ارد گرد لوگوں کا جھوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماشا بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بُری طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خود کشی کے ارادے کے جُرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خود کشی بھی کتنا عجیب جُرم ہے، جُرم کا ارادہ ہو یا اگر جُرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جُرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز جھوم میں ابھری۔ ”ہو دو رہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ.....“ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

بائیں ہم ندیم جو ان لسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیقی کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے ایک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت رفلوں، بدینت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہوا ہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں کس قدر بخلت سے کام لیتے ہیں، ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پرانا جاننے والا نہ مل جائے، اور ٹھیک اُسی وقت بھیڑ کودھکیل کر اندر آنے والے نے میرا اندیشہ بچ کر دکھایا۔ آنے والا خانو تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گم صم ہی رہ گیا۔ خود میں بھی اسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دوڑ کر مجھ سے ملٹ گیا اور رونے لگا ”کیوں قلم کرتے ہو ہم غریبوں پر سائیں، کیوں بار بار مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟“ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ”مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟“ ”آس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسبِ عادت کسی حوالہ کی طرح سب کو ڈانٹا ”جاؤ یہاں سے بابا..... کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے، جو تم سارے یوں منہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، کام کرو اپنا، شکر کرو سائیں جی ادھر آ گیا ہے، اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے۔ چلو، اب بھاگو سارے یہاں سے۔“ دھیرے دھیرے بھیڑ ٹھنسنے لگی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو بیوی نے ضد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، لہذا خانو نے کچھ عرصہ قتل کسی سے سفارش کروا کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کینین بنالیا اور اب وہ اپنی بیوی بچوں سمیت اسی شہر میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کنگول میں مقدر بار بار بیوی پرانے سٹے کیوں ڈال دیتا تھا۔ مجھے خانو کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا تھا، مگر..... وہ میرا نادان دوست تھا۔ اور مجھے شاید کسی نادان دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھوکھو کھایاں بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رعب بٹا رکھا تھا۔ خانو نے تھوڑی دیر ہی میں پلیٹ فارم کے شیڈ سے پرے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے میرا ہیرا بٹا دیا۔ فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پتھر پرانا چھپر، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش۔ درخت کے نیچے یہاں بھی کئی اینٹ اور سینٹ سے بنے ایک گول چبوترے نے برگد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، بالکل میرے غموں کی طرح، جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھیرا ڈالے رکھتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رُکا اور میری خستہ حالی دیکھ کر گھبرا گیا ”تمہیں تو شاید شدید بخار لگتا ہے جو گی سائیں۔“ ”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ٹھکن ہے بہت لمبے سفر کی، تم جاؤ بیوی بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے، مجھے ابھی جاگنا ہے، اس شہر کا آسمان اور یہ تارے میرے پرانے دوست ہیں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں، ان سے مجھے آج رات.....“ نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبور اُوہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اسے کچھ دیر مزید روک لیتا تو اچھا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، اینٹوں اور سینٹ کی بنی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہو گی، شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی مجسمہ تراش رہی ہو گی یا پھر شاید اپنی چھت پر اپنی پسندیدہ زرد پھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا گنگ تھا میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں بھیجنے لگیں، تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا، کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔

صبح تک میں مزید نہ حال ہو چکا تھا اور جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا، تو حسبِ معمول سب سے پہلے ضعیف العقیدہ لوگ ہی میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصہ رہا ہو گا، کیوں کہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا رُوت شکر گڑھ رہا تھا، وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ”کرامت“ کے بہت قفسے مَن رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں ٹھٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا۔ تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا ”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، کون ہے یہ جھنڈو؟“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز سن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار ادھر ادھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا ”کون ہو تم..... اور کیا تم جانتے نہیں کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بئیرا ڈالنا ممنوع ہے۔“ میں بہ مشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا ”بئیرے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب؟ شاید مکین ممنوع یا غیر ممنوع ہوتے ہیں۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے، مگر بخار کی ٹھکن اور نقاہت کی وجہ سے ایک زوردار چٹکر آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی ”ارے ارے..... سنبل کے بھئی، تمہاری طبیعت تو بہت ناساز لگتی ہے۔“ اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر قلعی دوڑے چلے آئے اور انہوں نے بھی مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے مسکن پر بٹھا دیا، میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تسلی دی ”نہیں، میں ٹھیک ہوں، میں خود بھی یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ زیادہ دیر نہیں ٹھوکیں گا یہاں پر۔“ اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ ”نہیں نہیں، ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتے ہو، کچھ لوگ اسی طرح چھپر ڈالتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے سرکاری زمین پر پہلے پکا جھونپڑا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں، مگر تم اس وقت اس قابل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکو۔ کچھ دن آرام کرو، طبیعت سنبل جائے تو چلے جانا۔“ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ مگر یہ شہر مجھے کانٹے کو دوڑاتا ہے۔ آپ ایک احسان اور کردیں مجھ پر، یہاں سے کہیں بہت دُور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروادیں مجھے.....“ اسنے میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آہنچا۔ پھر سنڈنٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔“ اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمبے کے لیے میرے پاس رُکا ”اعجاز نام ہے میرا، فی الحال تم آرام کرو۔ میں ذرا دفتر کے معاملات نمٹاؤں، تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ذرا صبر سے کام لو۔“ اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب ٹھنسنے کی عادت ہی نہیں رہی، پھر چاہے وہ صبر کا پھل ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کے شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے تھما گیا۔ ”یہ دوایاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں۔ جلدی سے یہ گولیاں اور شربت غنک جاؤ۔ ہمارے اعجاز صاحب نے ڈسپنسر کورس بھی کر رکھا ہے۔ یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود ہی کرتے ہیں۔ شام کو ان کی بیٹھک میں خوب ہجوم رہتا ہے۔“ وہ باتوں ہی جانے کیا کچھ کہتا رہا اور تب تک وہاں سے نہیں ہلا، جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی، کچھ لوگ اپنے لفظ اسنے بے دریغ کیوں لٹاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کینین کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ”سائیں جی، وہ کالو ٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے تمہاری طرف، سب خیر تو ہے ناں!!“ ”ہاں، سب خیر ہے، وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے۔ اچھے انسان ہیں۔“ خانو کے چہرے پر چھائی فکر مندی کی لکیریں چھٹ گئیں۔ اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اعجاز صاحب کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا کہ دیکھنے میں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں، مگر دل کے بہت اچھے ہیں، سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ، جانے یہ اوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے اتنے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تضادات کا مجموعہ ہے۔ میں دن بھر وہیں منہ ڈھانپے پڑا رہا۔ نقاہت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوت پر دوا نہیں دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوت ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہوتا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پھڑک کر رہی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دُور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا، مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔

شام کو اعجاز صاحب نے بھی دوسرا پھیرا ڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے۔ بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو، پھر یہ جو گ کیوں لے رکھا ہے۔ بھی معاف کرنا میں اس جبری فقری پر اعتبار نہیں کرتا۔ آج کل کے اس منافق دور میں اصل پیر فقیر بھلا کہاں پائے جاتے ہیں؟“ اعجاز صاحب کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی۔ ”ٹھیک کہتے ہیں آپ، کاش! یہ چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آ جائے کہ صرف حلیہ، درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ دیوانے اور مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اعجاز صاحب نے چو تک کر میری طرف دیکھا۔ ”آدمی دل چسپ لگتے ہو۔ موقع ملا تو کبھی تفصیلاً بات ہو گی۔ تم آرام کرلو۔“ اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی دُور اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو لپک کر میرے قریب آ گیا، ”کیا کہہ رہے تھے، اسٹیشن ماسٹر صاب! میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا۔“ ”ہاں کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن ادھر کی ادھر لگا رہتا ہے، دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے۔ سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔“ میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ”کیا بول رہے ہو جو گی سائیں، میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔“ ”تم محنت کم، باتیں زیادہ کرتے ہو۔ آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو۔“ خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر نکالیا۔ میں جانتا تھا کہ اب رات گئے تک کام میں بھجا رہے گا، میرا وہ نادان دوست۔

شام ڈھلی تو میرے دل کے اندھیرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جگمگانے لگا، مگر جو میرے تاریک دل کو اُجالا سکتا، وہ اُجالا کہاں تھا میری قسمت میں۔ خانو بے چارہ دن بھر کام میں بٹتا رہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برداری اور خدمت گزاری سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ پتھر تھا، جس سے ٹکرانے والا پجاری بدلے میں صرف زخم ہی پاسکتا تھا۔ رات ہوئی تو

اسٹیشن ماسٹر صاحب حسبِ معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایت دیتے نظر آئے، مگر جانے کیوں اس رات مجھے اعجاز صاحب کی چال اور آواز میں وہاں کینین اور کڑک مفقود محسوس ہوئی، جوان کی شخصیت کا خاتمہ تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے دُور ک گئے ”تم سوتے نہیں ہو کیا، طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟“ ”ٹھیک ہوں، بس نیند آتے آتے آتی ہے۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں وہیں چبوترے پر میرے قریب بیٹھ گئے ”ہاں ٹھیک کہا تم نے، کبھی کبھی تو نیند بھی خربلی شہزادی بن جاتی ہے۔“ ”آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟“ ”انہوں نے ایک گہری سانس لی ”ہاں، اب تو ٹھیک ہی سمجھو، وہ کہتے ہیں ناں، درد کا حد سے گزر جانائی دوا ہو جاتا ہے۔ تم یہاں نئے ہو، اس لیے تمہیں نہیں پتا کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پرانے ملازمین سارے واقف ہیں اس کہانی سے۔“ میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دبائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظری کب آتا ہے بھلا؟“ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔“ اعجاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی ”بس بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس بد نصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا وقت بستر پر پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی ثریا..... بچپن ہی سے ہم دونوں کی جان..... لاڈ اور نازوں سے پلی۔ اسکول کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ہر مضمون، ہر مقابلے میں اول۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ بچ پوچھو، تو اس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی خوف زدہ ہو جاتے تھے، اس لیے جلد ہی

اس کے ہاتھ پیلے کر کے رخصت کرنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ بہت سے رشتے آئے، مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی، جہاں ساس نندوں کا جھیلنا بھی کم ہو، اور لڑکا معاشی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے ثریا کو بہت نازوں سے پالا تھا۔ اور ہمیں یہ ڈرتھا کہ وہ روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار، رشتہ لانے والی نے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بتایا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی بیرون ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا۔ اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے لگا، جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان بین کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا۔ اور ثریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتہ والی کا درہ پکڑ لیا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری ثریا سے، ورنہ

ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا، مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا ہچکچاہی تھی۔ ”میں نے حیرت سے اچھا صاحب کی طرف دیکھا ”مگر کیوں؟“ اعجاز صاحب نے نظریں نیچے کالیں ”دراصل لڑکا کچھ کم صورت تھا، ہماری شریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولار رنگ اور نین نقوش بہت بچہ محسوس ہوتے تھے۔“ اعجاز صاحب کی بات سُن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا ”شریائے کلیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں.....“ ”شریایا فیصلہ وہی تھا، جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ بالآخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی کھلا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آنسوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”پھر آپ اتنے اُداس کیوں ہیں، انسان کا توازنِ خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بد صورتی کی تو عادت پڑ جاتی ہے۔“ مجھے لگتا یہ سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے لمبی گہری آہ بھری۔ ”ہاں! میری شریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ کلیم تو پہلے ہی سے شریا کے پیار میں دیوانہ تھا، مگر.....!!“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ”مگر کیا؟“ ”مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو چھلتا پھولتا اور خوش دیکھ سکتے

ہیں۔ کلیم اور شریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے، پہلوئے حور میں لنگور، جیسے فقرے کسے جاتے۔ تنگ آ کر کلیم نے شریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا غصہ شریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور شریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہوگی، ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم صورت کو کیوں قبول کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور شریا کی ٹُوب صورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے گلی محلے، حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہونے لگا۔ شریا کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور شریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا پڑا ہے، پھر چاہے یہ جوڑ معاشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم شریا پر شک کرنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اسے دُھنک کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن شریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نیل نیل تھا۔ اور..... اور پھر.....“ اعجاز صاحب کی قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابلی سے پوچھا ”پھر کیا ہوا؟“ ”اور پھر شریا کے آنے کے دو روز بعد کلیم نے اسے طلاق بھجوا دی.....“ میری آواز حلق میں انک سی گئی ”طلاق.....“ ”ہاں! طلاق.....“ تین سال پہلے ہماری شریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت صابر شا کر تھی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر شریا سستی رہی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔“ مجھے یوں لگا، جیسے اعجاز صاحب نے کوئی کند چھری ٹھیک میرے قلب میں اتار دی ہو۔ ”کیا..... شریا مر گئی؟“ ”ہاں، آج اس کی تیسری برسی ہے۔“ مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اعجاز صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی سنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان مذاہب کا شکار ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک ”پڑی زاد“ کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھندھرائے بیٹھے ملتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بھلے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں یعنی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی عالمِ دنیا کے باسی تھے، یعنی مجھے قبول کر بھی لیتی تو یہ جگ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بدل صرف روپ ہے، ترازو کے ایک پلڑے میں خُسن ہو تو دوسرا بات سبھی اسے متوازن کر سکتا ہے، جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنناٹا ہوتی رہی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی ہلکی ہلکی آوازوں نے مجھے دوبارہ جگادیا۔ صبح ہو چکی تھی، خانو مجھے بتا رہا تھا کہ ”سامیں یہ بی بی کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے، سامیں کا بڑا نام سنا ہے۔ دعائے آئی ہے۔“ میں نے چونک کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان، زمین پر ڈھے گیا اور زمین فلک سے جا ملی۔ میرے سامنے یعنی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری مجسمہ ساز۔ وہی قراءۃ العین..... مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک۔ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشمہ اتار دے، مگر خانو چاچکا تھا۔ میں نے دھیرے سے بھاری آواز میں کہا۔ ”بی بی! اپنے چہرے سے اندھیرے کا یہ پردہ ہٹا دو تا کہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری روح کے زخم دیکھ سکوں۔“ مگر وہ رو پڑی۔ ”نہیں سامیں جی! میری آنکھیں بے نور ہیں۔ آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے۔ میں زور سے چلا اٹھا۔ ”کیوں..... تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں.....؟ اگر دعائی کروانی ہے تو اپنی بیٹائی کی دعا کرواؤ۔“ یعنی نظریں چڑا گئی۔ ”نہیں سامیں، جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں بیٹائی کا کیا کروں گی۔“ میں اس کی بات سُن کر سسک اٹھا۔ وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔ ”سامیں جی! کیا ہوا، سب خیر تو ہے نا..... تم رو کیوں رہے ہو، کیا کوئی برا سہنا دیکھا ہے۔“ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر ٹھکا ہوا میرے گالوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خانو کو سمجھا۔ مجھا کر کام پر بھیجا، مگر خود میرا چین و سکون مزید برباد ہو گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ سنے کے پنجرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار، ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا، جیسے وہ خواب اُدھورا رہ گیا ہو۔ شاید یعنی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں، مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا، جس نے درمیان میں میری نیند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا۔ سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب ہمارے خواب سچے ہونے لگتے ہیں۔ قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیئے تھے۔ پہلا شریا اور کلیم کی کہانی سنا کر اور دوسرا یہ اُدھورا خواب دیکھا کہ۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جتنا چاہ رہی تھی کہ یعنی اگر بیٹائی ملنے کے بعد مجھے دیکھ لیتی، تو وہ ضرور درو کر خدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھ ہی رہتی تو اچھا تھا۔ میرے اندر چلتے بھگت تیز ہونے لگے۔ جیسے واقعی میں نے مجھ دیکھ لیا ہو۔

میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ سانس بھی انک انک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں ترپتے دیکھا تو ہنا کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔ اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے ایک مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا بکسہ اٹھائے اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور تشویش سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے سامیں کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین خوراکیں دینے تو جا رہا ہوں، مگر ہو سکے تو سامیں کو شہر کے بڑے اسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔“ خانو نے تیزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ملنے والا۔

اگلے روز بادل پھر ٹوٹ کر برسے، میری سانس اکھڑنے لگی تھی، جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اسے بہت سی سلاخوں سے نکرا کر باہر نکلنا پڑ رہا ہو۔ میری نظردھیرے دھیرے پتھرانے لگی، تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو سامیں، ایک بار میری بات بھی مان لو، چلو کسی بڑے اسپتال چلتے ہیں۔“ میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو پانی میں مل کر پانی ہوتے دیکھے اور مُسکرا دیا۔ میری آواز رُک رُک کر نکل رہی تھی۔ ”کیوں ڈھونڈ گئی کہیں کے..... ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سامیں کی کرامات پر تمہارا یقین اور اعتماد چٹا دیا؟ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سامیں اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ اور آج جب خود تمہارا سامیں بیمار پڑا، تم اسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک چھونک ہی میں ہو نہ ہو جاتی؟“

تیز بارش میں بھیگی ایکسپریس گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی، تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ مسافراترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے دُور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا۔ میری لمبی جٹا دھاری بالوں کی لٹیں بھیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل چکی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مراقبے میں پڑا ہوا تھا، جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا بیولا ابھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اسے دبے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا، مگر وہ برستی بارش میں یوں ہی دھندلائے بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبور اُواہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ فضا بہت اور غنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں، مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی، جیسے ضد پر اڑی ہو۔ اور پھر وہ ہلکا سا کھٹکار کر بولی تو اس کی مترنم آواز نے میرے وجود میں ٹھپسی سبھی خفیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ارد گرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس میٹھی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں..... یہ اسی کی آواز تھی، جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سُن سکتا تھا۔ میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ”مجھے پتا ہے کہ آپ اپنے ارد گرد دو خواتین کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے، مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے جھبک رہی ہوں بد در..... میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ آپ کی دعا کا بڑا چرچا سنا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔“ میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی ٹُوب صورت انگلیوں کو حسبِ عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے، جنہوں نے کبھی میرا چہرہ چھو کر ایک مجسمہ تراشا تھا۔ میری نیچگی نظر نے اس کے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی، پہچانتی بھی کیسے۔ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میری رُکتی سانسوں کی آواز سُن کر وہ گھبرا کر میرے اور قریب آ گئی ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ ”افتخار میری نظر اس کی آنکھوں پر لگے کالے چشمے پر پڑی تو میرے اندر یہ یک وقت کئی جھگڑ چلنے لگے۔ حسبِ توقع ایک چشمہ اس کی خوب صورت سرمئی آنکھوں کا پہرے دار بننا بیٹھا تھا۔ کہیں خدا نخواستہ یعنی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ تیز بارش اس کا نازک وجود بھگور رہی تھی، میرا جی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے وجود کے لیے جھڑی بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور بچے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی دو زانو بیٹھی بھیگتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو جیسے۔ اسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روکا۔ بس زبانِ دانتوں تلے داب لی۔ مڑتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈھلگائی، میں تڑپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو چھو گئے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے سشدر رہ گئی اور پھر اس نے بے تابلی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی ”پڑی زاد..... یہ آپ ہی ہیں نا..... آپ چپ کیوں ہیں.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟“ میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت ہوتی، تو پھر روانہی کس بات کا تھا۔ میں لڑکھڑا کر یوں گرا، جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے، مگر مجھے دنیا کی نظر سے گرنے کی پرواہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک نگاہ سے پچتا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر فنا قبول تھی، مگر اس کی نظر میں نفرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر قضا تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ ”کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پڑی زاد صاحب..... میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا۔“ ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، آس پاس چلتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ یعنی وہیں دُور بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی ”مجھے جانے دو عدنان..... اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تیاگ دی۔ وہ نظر میرا اچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے۔ میں بہت بُرا حال اور بڑا گھائل ہوں عدنان۔ مجھے اور زخمی نہ کرو۔ میرا دم میرے اس آخری بھرم

کے ساتھ نکل جانے دو.....“ عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی.....؟“ ”نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔“ عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ ”محبت نہیں کی، تو پھر یہ جوگ، تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمائی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گرہ خود گھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چچین لیٹے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندگی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بھرم آپ سے بڑے تھے اور آپ اسی کوچ منجھدار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟“ میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ”میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ مانگتا، تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اُن گنت احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان..... میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیار بھری ایک نظر۔“ عدنان نے حتیٰ لچھ میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بھرم بھی آزمالیتے ہیں۔ وہ آ رہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسب وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے، تو عینی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اُس کا آپریشن تو کروادیا، مگر بیٹائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔“ میں چلا اٹھا، ”مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“ ”تجبی عینی کی آواز میرے قریب سے اُبھری۔“ وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد..... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے بڑ جائیں تو چہرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسہ بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔“ خانو نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دو زانو بیٹھ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی ٹھنڈے پانی کی ابشار تلے آ گئی۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے یوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاہی ڈھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے ٹھوتے ہی کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ ”پری زاد“ بن گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، تمسخر یا نفرت سے مبرا۔ ایک پیار بھری نظر۔ میرے مقدر کی نظر..... ”وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔“ میں بھی کتنی بد نصیب ہوں۔ آپ نے سب سے پچھا کر جس محبت کو اپنے من میں دبائے رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے..... تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں..... اتنا کم زور سمجھ کر کھا تھا آپ نے قراۃ العین کو۔“

دُور کھڑے قضا کے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ ”انشاء جی اٹھو..... اب کوچ کرو۔“ میں نے چند سانسیں مزید اُدھار مانگیں اور اس مہ و ش کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ”نہیں عینی..... میں تم پر زندگی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دنیا میں ایسی کون سی کمی ہو جاتی۔ میں تو یوں بھی تمہاری زندگی میں اضافی تھا۔“ اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے چہرے کو پاک کرتے رہے۔ ”پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد، مگر آپ سے دُور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ ہی سے پوری ہوتی ہے۔ آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکا جا کر پتا چلا کہ آپ اضافی نہیں، لازمی ہیں۔“ میں نے عینی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پکلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ہاں..... کبھی نہیں کہہ پایا، مگر آج کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین..... شدید محبت۔“ میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں قضا دھیرے سے گنت گنتائی۔ ”وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جو گی کا نگر میں ٹھکانہ کیا؟“ اس پاس کا سارا شور مجھے دھیرے دھیرے سر گوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے لوگ آپس میں کیا سرگوشیاں کر رہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پار رہی تھی۔ اتنی تیز آندھی کے باوجود، جس سے میرا دم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سر گود میں لیے زار و قطار رو رہی تھی۔ زندگی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آتی ہے، جب غم بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ آج میری غم بھر کی چٹیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو جینے یا مرنے سے غرض تھی۔ کتنی صدیاں اس ایک پل میں جی جی تھیں میں نے۔ زندگی نے ہر قرض چکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں، تو آس پاس دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھر آنے لگیں، کبھی سنا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمبے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر بین کر رہے ہوں۔ جانے سب رو کیوں رہے تھے، میری پتھر آئی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جی ہوئی تھیں، جس نے میری تکمیل کر دی تھی۔ خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے پلٹ کر میری طرف اشارے کر کے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اس نے عینی کو تھام رکھا تھا۔ ہاں، اب وہی تو اس کا سہارا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا۔ مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رُک کر سارے جسم میں جامد ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اندھیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے ”اناللہ وانا الیہ راجعون“ کہہ کر میرے چہرے پر بند کر دیئے۔ اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو

اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

مدد کرنی ہو اُس کی، یار کی دھارس بندھانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

بدلتے موسموں کی سیر میں، دل کو لگانا ہو

کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو

کسی کو موت سے پہلے، کسی غم سے بچانا ہو

حقیقت اور تھی کچھ، اُس کو جاکے یہ بتانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

(ختم شد)